انقلاب

ا

انقلاب

اور

اور دوسرے افسانے

اعظم کریوی

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

پہلی بار ۱۹۴۴ء

قیمت ——— ایک روپیہ بارہ آنہ

باہتمام محمد اسمٰعیل صدیقی
ادبی پریس لاٹوش روڈ لکھنؤ میں چھپی

ناشرین

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

فہرس

اِنقلاب

جوکھو نے چلم کا دم لگاتے ہوئے مہابیر حلوائی سے کہا۔
"اب ہمارے گانو میں بھی لچھمی دیوی کی کرپا ہونے والی ہے"
مہابیر نے اپنے بوسیدہ خوانچہ پر سے مکھیاں اُڑاتے ہوئے پوچھا
"سو کیسے" جوکھو "ارے کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ ہمارے گانو میں ہوائی جہاز کا کارخانہ کھلنے والا ہے اب تمھاری تو خوب موج رہے گی" مہابیر نے اپنی پرانی گڑ کی جلیبی پر حسرت سے نظر ڈالی گذشتہ اتوار کو سیر بھر بازار سے خرید لایا تھا لیکن اب تک بکنے کی نوبت نہ آئی تھی خوش ہو کر دریافت کیا

"میری موج کیسی رہے گی"

جو کھو۔ واہ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے آج کل تم بڑی مشکل سے دن بھر میں دو پیسے کی ریوڑی یا جلیبی بیچتے ہو گے گانو والے ان کی قدر کیا جانیں مُدا (مگر)، جب کارخانہ بن جائے گا تو تمہاری اتنی مٹھائی بکے گی کہ بہت جلد سیٹھ بن جاؤ گے۔

مہابیر نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے کہا "سو بھیا تم بڑے مزے میں رہو گے تاڑی کی قیمت چوگنی ہو جائے گی" جو کھو کلوار نے ہاتھ سے چلم رکھ دی اور بولا "میں تو اب شراب کا بھی ٹھیکہ لینے والا ہوں کل میں شہر گیا تھا وہاں داروغہ جی اور تحصیلدار صاحب نے خود مجھ سے کہا ہے کہ سیٹھ ہوائی جہاز کا کارخانہ تمہارے گانو میں کھلنے والا ہے ہم سوائے تمہارے اور کسی کو شراب کا ٹھیکہ نہ دیں گے" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہاں پر مہاراج گنیشی اور شبراتی میاں آگئے اریا کے یہ دونوں زمیندار تھے مہابیر اور جو کھو نے اٹھ کر مہاراج کو پالاگن کی، آشیرباد دیکر مہاراج بولے "یارو کیا بات کر رہے ہو؟"

جو کھو۔ مہاراج! وہی کارخانہ کی بات چیت کر رہے تھے۔

مہاراج۔ معلوم نہیں کس کی زمین میں کارخانہ بنے گا۔

جوکھو۔ سو یہ تو مجھے معلوم ہے کہ کارخانہ مشترکہ زمین میں بنے گا مگر یہ سنا ہے کہ زیادہ تر زمین آپ کی چودھری گھسیٹے اور شبراتی میاں کی ہے کچھ زمین ہر بجنا بنیا کی بھی ہے۔

مہاراج۔ کہیں سرکار زبردستی زمین پر قبضہ نہ کر لے۔

مہابیر۔ سرکار ایسا جلم (ظلم) کبھی نہ کرے گی۔

جوکھو۔ تحصیلدار صاحب تو معاوضہ دینے کو کہتے تھے کل وہ خود گاؤں میں اسی کا فیصلہ کرنے آئیں گے۔

مہاراج۔ مجھ کو بھی وشواس ہے کہ معاوضہ ملے گا چلو ذرا چودھری گھسیٹے اور بکریدی میاں سے بھی اس کا ذکر کریں۔

جوکھو۔ بکریدی میاں سے کیا ذکر کرو گے جب اُن کا لڑکا شبراتی میاں آپ کے ساتھ ہی ہے تو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔

مہاراج۔ نہیں بھائی جب تک بکریدی میاں زندہ ہیں ہم لوگ اُن کے سامنے شبراتی میاں سے کچھ نہ پوچھیں گے کیوں شبراتی میاں ٹھیک ہے نا!

شبراتی میاں کو دل میں تو یہ مہاراج کی بات اچھی نہ معلوم ہوئی مگر بظاہر ہاں میں ہاں ملا دی۔

بکریدی میاں کے یہ اکلوتے لڑکے تھے حال ہی میں

اِن کی شادی ہوئی تھی بگریدی میاں نے اپنی تمام جائداد شبراتی میاں ہی کے نام لکھ دی تھی لیکن پھر بھی وہی سب کام کرتے تھے شبراتی میاں کو زمینداری یا کاشت کاری سے کوئی سروکار نہ تھا۔

—— (۲) ——

امریا ضلع ہوشنگ آباد میں ایک چھوٹا سا گانو تھا۔ چودھری گھسیٹے، مہاراج گنیشی بگریدی میاں اور ہر بجابنیا کی یہاں زمینداری تھی ان لوگوں کو زمینداری سے تو کچھ زیادہ فائدہ نہ تھا ہاں کاشتکاری سے بخوبی بسراوقات ہوجاتی تھی جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہاں پر سرکار ہوائی جہاز کا کارخانہ بنانے والی ہے تو ہل چل مچ گئی اور سب لوگ بگریدی میاں کے دروازہ پر پنچایت کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ جوکھو کلوار تحصیلدار سے پہلے ہی مل آیا تھا تحصیلدار صاحب نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ جب کارخانہ بن جائے گا تو پھر وہ جوکھو کو شراب کا ٹھیکہ دلادیں گے۔ چنانچہ اسی لالچ میں وہ گانو بھر کو ورغلا رہا تھا جب بگریدی میاں کے دروازہ پر بہت لوگ جمع ہو گئے تو سب سے پہلے اسی نے اٹھکر کہا۔ بھائیو بڑی

خوشی کی بات ہی کہ سرکار ہمارے گاؤں میں ہوائی جہاز کا کارخانہ بنانے والی ہی کارخانہ بن جانے سے ہم غریبوں کا بھی بڑا فائدہ ہوگا جن لوگوں کو دو آنہ مزدوری بھی مشکل سے ملتی ہی اب ان کو روپیہ روز مل سکیں گے دھوبی، کمہار، حلال خور، چمار، بنیا، امیر سب ہی کا فائدہ ہوگا۔

مہاراج گنیشی کو اپنی پڑی تھی جھٹ سے بول اُٹھے اور میرا کیا فائدہ ہوگا۔

جو کھواب چودھری بکمریدی میاں اور ہربجنا کی زمین ہی پر تو کارخانہ بنے گا معاوضہ میں سرکار روپیہ دے گی ایک بات اور ہی ابھی تو گاؤں میں دو چار سو آدمی ہوں گے کارخانہ بن جانے سے ہزار بارہ سو آدمی ہو جائیں گے چندہ سے ایک چھوٹا سا مندر بن جائے گا اور بس آپ وہاں پر بیٹھے ہوئے ست نرائن کی کتھا کہیئے گا بڑی آمدنی ہوگی۔ اعتراض کی گنجائش نہ تھی مستقبل کی خوشی نے مہاراج کو مآل کی فکر سے آزاد کر دیا۔ لالچ نے کچھ سوچنے کا موقع بھی نہ دیا خوش ہو کر بولے بھائیو جو کھو ہی تو ان پڑھ پر نت (مگر) بات پتے کی کہتا ہی کیوں چودھری تمھاری کیا رائے ہی مہاراج کا گاؤ

میں بڑا اثر تھا۔ چودھری نے بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملادی
تھا بیر حلوائی ایک طرف بیٹھا ہوا خیالی قلعہ بنا رہا تھا میں
خوب بڑی دوکان کھولوں گا۔ لکھنا کی اماں بہت دنوں سے
گڑوا بنوانے کو کہہ رہی ہے اب اس کو ضرور زیور بنوادوں گا
ہر بچا بنیا کی طرف دیکھ کر بولا کیوں سیٹھ تمھاری کیا رائے ہے'
گرستو اور چبینا ہی پر ہر بچا کی دوکان کا دارومدار تھا زمینداری
بہت تھوڑی تھی زمین پرتی پڑی تھی اس سے کچھ آمدنی کا سہارا
تھا اس نے بھی سوچا کہ کارخانہ سے میری دوکان بھی چمک
جائے گی اس نے بھی رضامندی ظاہر کردی اب سب بکریدی
میاں کی رائے معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف دیکھنے لگے۔
شبراتی میاں کو نوجوان سمجھ کر کسی نے کچھ پوچھنے کی ضرورت
نہ سمجھی شبراتی میاں کو بہت بُرا معلوم ہوا اور وہ وہاں سے
کھسک گئے۔

بکریدی میاں پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ بیوی عرصہ
ہوا مرچکی تھی اس کی یادگار شبراتی میاں تھے اکلوتا لڑکا سب کا
لاڈلا ہوتا ہے چنانچہ انھوں نے بڑے ناز و نعم سے شبراتی
میاں کی پرورش کی پڑھانے لکھانے کی انھوں نے کچھ ضرورت

نہ سمجھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ تھوڑی بہت زمینداری اور موروثی کاشتکاری بہت کافی ہے۔ شبراتی میاں جب سولہ برس کے ہوئے تو بکریدی میاں نے اُن کی بڑی دھوم دھام سے شادی کر دی۔ بیوی کے مرنے کے بعد بہو نے گھر کا تمام کام سنبھال لیا۔ بکریدی میاں کے گاؤں والے بڑی عزت کرتے تھے جب اُن کی رائے دریافت کی گئی تو وہ کھنکار کر بولے میرے خیال میں تو کارخانہ بن جانے سے ہمارا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔

مہاراج نے جوکھو کی طرف دیکھ کر کہا اب بولو!

جوکھو نے بکریدی میاں کی طرف دیکھ کر کہا واہ! بابا آپ بھی خوب کہتے ہیں وجہ تو بتائی نہیں اور کہہ دیا کارخانہ سے گاؤں تباہ ہو جائے گا کارخانہ تو پڑتی میں بنے گا پڑتی تو فضول پڑی ہی اس سے گاؤں والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہی کارخانہ بن جانے سے وہاں پر بہار آجائے گی۔

مہاراج نے بکریدی میاں سے ہنس کر کہا بابا تم جوکھو کو ایسا ویسا نہ سمجھو بڑی پتہ کی بات کہتا ہے آپ نے اس کو آلھا اودل پڑھتے سنا ہی ہوگا۔ رام دے اس جوار میں

تو اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا سچ تو کہتا ہے کہ ٹرتی سے ہمارا کیا
فائدہ ہے۔

بکریدی میاں ابھی تو ٹرتی ہی کا نام ہے لیکن تم سب لوگ
دیکھ لوگے کہ آہستہ آہستہ آس پاس کی اچھی زمین پر بھی سرکار
قبضہ کرلے گی جہاں آج لہلہاتے کھیت ہیں وہاں کل چٹیل
میدان ہوگا یہی نہیں بلکہ وہ زمانہ بھی آجائے گا جب ہم اپنے
مکانوں سے نکال دئے جائیں گے ہمارے کچے مکانوں کو گراکر
پکی عمارتیں بنائی جائیں گی لیکن اس پر دوسرے لوگ قابض
ہوں گے ابھی کہتے ہو کہ صرف کارخانہ بنے گا لیکن یہ تمہاری
بھول ہے کارخانہ بنے گا تو اس کے ملازموں کے لئے بھی بارکیں
بنائی جائیں گی اور ان کے لئے بھی زمین درکار ہوگی افسروں
کے لئے بنگلے بنیں گے اور ہماری ہی زمین پر قبضہ کیا جائے گا
ہماری بہو بیٹیاں جو آج بڑی آزادی سے کھلے منھ باہر آتی جاتی
رہتی ہیں اور ان کی طرف کوئی بری نظر سے دیکھنے کی جرأت
نہیں کرسکتا۔ یہ دیسی ان کا مذاق اڑائیں گے گھر سے باہر نکلنا
دشوار ہو جائے گا تم کہتے ہو ٹرتی سے ہمیں کیا فائدہ ہے اس کا
جواب یہ ہے کہ وہاں بڑی بڑی گھاس اگتی ہے ڈھور ڈنگر چرتے

ہیں جب چراگاہ ہی نہ ہوگی تو مویشی کیا چارہ کھائیں گے۔

ایک اہیر بیٹھا اونگ رہا تھا بگریدی میاں کے آخری الفاظ سن کر چونک اُٹھا اور بولا تو یہ کہو کہ کارخانہ کیا بنے گا ہمارے لئے مصیبت آجائے گی۔

جوکھو نے دیکھا کہ معاملہ بگڑا جاتا ہے جھٹ بول اُٹھا ہمارے گانو کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے کیا پرتی ہی کی گھاس سے کام چلتا ہے بابا برا نہ مانو تو ایک بات کہوں سرکار نے ہی ہم کو زمین دی ہے اس کا جب جی چاہے ہم سے چھین لے ہمارا کچھ بس نہیں چل سکتا فریاد کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

بگریدی میاں نے اداس ہو کر کہا جب یہی بات ہے تو پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی جو تمہارے جی میں آئے کرو لیکن میں اپنی زمین سرکار کو خوشی سے نہ دوں گا۔

جوکھو نے کہا لیکن تمہارا کچھ بس نہ چلے گا سرکار تم سے زمین ضرور لے گی خوشی سے دوگے تو خیر ورنہ زبردستی چھین لے گی اور مُفت میں گانو کی بدنامی ہوگی۔

چودھری گھسیٹے گانو کے مکھیا تھے اُنھوں نے سوچا کہیں مفت میں نہ پس جاؤں تحصیلدار صاحب کو خبر ہو جائے گی کہ

ہیں نے لوگوں کو بہکایا ہے تو میرے حق میں بہت برا ہوگا کہنے لگے ہاں بھائیو جو کام کرو سوچ سمجھ کر کرو "دریا میں رہنا گرمے بیر" کوئی اچھی بات نہ ہوگی - ہم سرکار ہی کا تو کھاتے ہیں میرے خیال میں کارخانہ بننے سے ہمارا کوئی نقصان نہ ہوگا بلکہ ہر طرح سے فائدہ ہی ہوگا کارخانہ کھلنے سے بازار بھی لگنے لگے گا سودا سلف خریدنے اور بیچنے میں ہر طرح کی آسانی ہوگی ابھی تو ہفتہ میں دو دن ہمارے گاؤں میں ڈاک آتی ہے کارخانہ بنتے ہی یہاں پر ڈاکخانہ بھی بن جائے گا۔ مدرسہ کھلے گا اس میں ہمارے بچے پڑھیں گے۔

بکریدی میاں نے کہا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے مگر جو خوش حالی اب ہمارے گاؤں میں ہے اس وقت نہ رہے گی۔

چودھری بولے رہے گی کیوں نہیں تم اب سٹھیا گئے ہو تمھاری باتیں بھی ایسی ہوتی ہیں۔

بکریدی میاں میری باتوں کی سچائی تم لوگوں کو ابھی نہیں کارخانہ کھلنے پر معلوم ہوگی۔

جوکھو نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا "دیکھا جائیگا"۔

(۳)

امریا میں تحصیلدار صاحب مع اپنے عملہ کے تشریف لائے اور چودھری گھسیٹے کے دالان میں اپنا ڈیرہ جمایا چودھری گھسیٹے مارے مارے پھرنے لگے کڑاہیاں چڑھ گئیں پوری اور خستہ کچوری تلی جانے لگی دودھ کے گھڑے آ گئے بیگاروں نے تحصیلدار صاحب کے گھوڑے کے سامنے ہری ہری دوب لاکر ڈال دی جوکھو کو تحصیلدار صاحب نے اپنی اردلی میں رکھا اور وہ چلم بھر بھر کر حقہ پلانے لگا جب تحصیلدار صاحب اور اُن کا عملہ کھاپی کر کچھ دیر آرام کر چکا تو کام کی باتیں شروع ہوئیں جس زمین پر ہوائی جہاز کا کارخانہ بننے والا تھا اس کا نقشہ تحصیلدار صاحب نے کھولا پٹواری نے مالکان کی فہرست پیش کی مہاراج گنیشی۔ چودھری گھسیٹے، بکریدی میاں اور رہر بجنا بنیا کا دل دھڑکنے لگا تحصیلدار صاحب نے جوکھو سے کچھ آہستہ آہستہ باتیں کیں اور وہ ان کے پاس سے اُٹھ کر چودھری کے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہا پرتی زمین کے علاوہ سرکار اور زمین بھی لے گی۔

مزروعہ زمین پر بھی قبضہ کیا جائے گا یہ سُنتے ہی سب کے ہوش اُڑ گئے۔ مہاراج نے گھبرا کر کہا اب کیا ہو گا۔

جوکھو بولا ہو گا کیا گھبرانے کی کچھ ضرورت نہیں سرکار کیا معاوضہ نہ دے گی تحصیلدار صاحب تو اسی کام کے لئے آئے ہیں لیکن میری بات مانو تو ایک کام کرو تحصیلدار صاحب کی بھینٹ کا کچھ انتظام کر دو بس سب کام بن جائے گا۔

بکریدی میاں ایک طرف چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے بگڑ کر بولے مجھ سے یہ کام تو ہرگز نہ ہو گا ایک تو زمین جائے اس پر رشوت بھی دوں کہیں ایسا بھی کسی نے اندھیر دیکھا ہے۔

جوکھو۔" تم جانو میں نے اچھی ترکیب بتائی ہے تحصیلدار صاحب کی کچھ خدمت کر دو گے تو اس کے بدلے میں وہ سرکار سے زیادہ معاوضہ دلا دیں گے آگے آپ لوگوں کی مرضی" یہ کہہ کر جوکھو نے ہر بجنا بنیا سے پوچھا" کہو مہتو! تمھاری کیا رائے ہے جواب خوب سوچ سمجھ کر دینا کیوں کہ سرکاری معاملہ ہے فریاد سے کچھ بھی فائدہ نہ ہو گا سرکار کو زمین کی ضرورت ہے وہ لے کر ہی رہے گی۔"

ہر بجنا بولا۔ جو مہاراج چودھری اور بکریدی میاں کی رائے ہو گی سو میری۔

چودھری گھسیٹے اور مہاراج نے جوکھو کی رائے مان لی

ہر بجا بنیا نے بھی ان کی تقلید کی لیکن بکریدی میاں نے صاف انکار کر دیا جوکھو نے تحصیلدار صاحب سے جاکر سارا حال کہہ دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراج چودھری اور ہر بجا کی پرتی کو مزروعہ دکھایا گیا لیکن بکریدی میاں کی مزروعہ زمین کو بھی تحصیلدار صاحب نے اپنی رپورٹ میں پرتی ظاہر کیا چنانچہ بکریدی میاں کے سوا سب کو حسب منشا معاوضہ کے لئے تحصیلدار صاحب نے سفارش کر دی۔

بکریدی میاں کب خاموش رہنے والے تھے بولے حضور انصاف کا خون نہ کیجئے غریبوں کو ستا کر کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

تحصیلدار صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ خاموش رہو میں کچھ سننا نہیں چاہتا جو کچھ سرکار نے حکم دیا ہے میں وہی کرتا ہوں اس میں میرا کیا قصور ہے۔

بکریدی میاں پھر بولے لیکن حضور ہماری سرکار کا یہ منشا نہیں ہے کہ آپ غریبوں کا گلا دبائیں۔

جوکھو نے کہا بکریدی میاں چپ بھی رہو حاکم سے زبان نہیں لڑایا کرتے۔

مہاراج اپنی وفاداری کیوں نہ ثابت کرتے کہنے لگے

ہمارے شاستر میں بھی لکھا ہے راجہ حاکم ایشور کا روپ ہوتا ہے یہ ایشوری نیائے ہے کچھ کہنا سننا فضول ہے۔

چودھری گھسیٹے تو گانو کے مکھیا تھے اُنھوں نے دیکھا کہ تحصیلدار صاحب کے خوش کرنے کا یہی موقع ہے کہنے لگے "ہاں بکریدی میاں تمھاری یہ بری عادت ہے کہ اپنے آگے کسی کی نہیں سنتے"۔

بکریدی میاں بولے "یارو کیا کہتے ہو ظلم ہو تو فریاد بھی نہ کروں"۔

پٹواری نے اپنی کارگذاری جتاتے ہوئے تحصیلدار صاحب سے کہا "گذشتہ جیٹھ میں تو بکریدی میاں نے اپنی تمام زمینداری اپنے لڑکے شبراتی میاں کے نام لکھ دی تھی لڑکا بالغ ہے اور وہی اب جائداد کا مالک ہے بکریدی میاں تو اب کچھ بول بھی نہیں سکتے"۔

بکریدی میاں۔ تو کیا شبراتی اور میں کوئی غیر ہوں آخر وہ میرا ہی تو لڑکا ہے۔

تحصیلدار صاحب بولے "شبراتی میاں کو بلاؤ میں بکریدی میاں سے کچھ بات نہیں کرنا چاہتا۔

جوکھو نے کہا حضور میں ابھی بلائے لاتا ہوں۔

تحصیلدار نے بکریدی میاں سے کہا تم یہاں سے چلے جاؤ شاید تمھاری موجودگی میں شبراتی میاں مجھ سے کھل کر نہ بات کریں یہ سرکاری معاملہ ہے اس میں کسی غیر کی مداخلت میں کسی طرح پسند نہیں کر سکتا۔

بکریدی میاں کی آنکھیں کھُل گئیں آج ان کو تحصیلدار صاحب کی بات سے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا تجربہ ہوا کہ باپ بیٹے کا ملاپ بھی سرکار کو پسند نہیں ہے گھبرا کر دالان کی طرف اشارہ کرکے بولے حضور میں اس کے اندر بیٹھا جاتا ہوں اس میں تو کچھ ہرج نہ ہوگا تحصیلدار صاحب نے مسکرا کر اجازت دی اور بکریدی میاں اُٹھ کر اندر جا بیٹھے وہاں سے وہ باہر کی سب باتیں بخوبی سن سکتے تھے شبراتی میاں گاؤں میں کہیں پر بیٹھے ہوئے اپنے لنگوٹیا یاروں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کی انھیں کچھ فکر نہ تھی صبح اُٹھتے ہی اپنی بچھیائیں گائے کا سیر بھر دودھ پیتے اور پھر گپ شپ اڑانے کے لئے گھر سے باہر نکل جاتے جب جوکھو نے ان سے جا کر کہا "چلو بھیّا تم کو تحصیلدار صاحب بلاتے ہیں" تو وہ

وہاں سے فوراً چودھری کے دروازے پر آئے راستہ میں جوکھو نے خوب اچھی طرح ورغلایا تحصیلدار صاحب نے شبراتی میاں کو دیکھ کر کہا "آؤ خاں صاحب میرے پاس بیٹھو" شبراتی میاں کا سر اونچا ہوگیا تحصیلدار صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں وہ میری اتنی قدر کریں گے اس کا تو مجھے خیال بھی نہ تھا۔

بکریدی میاں نے بھی سب کچھ سُنا اور دیکھا، اُنھوں نے سوچا "تحصیلدار صاحب میرے لڑکے کو بہکا رہے ہیں ہائے اگر اس نے معاوضہ قبول کر لیا تو میری کتنی بھد ہوگی گانْو والوں کی نظر میں ذلیل ہو جاؤں گا نہیں نہیں شبراتی بغیر میرے پوچھے ہرگز کوئی جواب نہ دے گا"

تحصیلدار صاحب نے شبراتی میاں سے کہا " دیکھو خاں صاحب یہاں پر سرکار ہوائی جہاز کا کارخانہ بنوانے والی ہے، اس میں تمھاری بھی زمین ہے سرکار کو اس کی ضرورت ہے آپ کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟" شبراتی میاں سے جب مہاراج نے کہا تھا کہ تمھاری رائے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسی دن سے وہ جلے ہوئے تھے آج تحصیلدار صاحب نے اُن کی رائے طلب کی تو وہ خوش ہو گئے اِدھر جوکھو اور ان کے

دوستوں نے بھی ان کو خوب بہکایا تھا۔ ہوائی جہاز کا کارخانہ کھلے گا تو خوب مزہ آئے گا قسم قسم کی دوکانیں کھلیں گی بازار لگے گا ہوائی جہاز دیکھیں گے شہر کا لطف گاؤں ہی میں آجائے گا شبراتی میاں مستقبل کی خوشی میں مگن تھے باپ سے پوچھنے کا انھیں کچھ خیال نہ رہا۔ جھٹ سے بول اٹھے "جو سرکار کی مرضی مجھے کوئی عذر نہ ہوگا"

شبراتی کی بات سن کر بکریدی میاں دنگ رہ گئے۔ شبراتی کی سعادت مندی پر ان کو بڑا ناز تھا وہ ناخلف نکل جائے گا۔ اس کا انھیں سان گمان بھی نہ تھا اگر اس سے پہلے کوئی ان سے کہتا کہ شبراتی خود مختار ہو گیا ہے تو وہ ہرگز یقین نہ کرتے لیکن آج ان کو معلوم ہو گیا کہ شبراتی پر اب ان کا کوئی اختیار نہیں رنج و غم سے بکریدی میاں کا کلیجہ پھٹنے لگا ہواس باختہ دالان سے باہر نکل آئے تحصیلدار صاحب نے چٹکی لی کہو بکریدی میاں اب کیا کہتے ہو شبراتی میاں تو راضی ہو گئے اب تم ان کو بہکا بھی نہیں سکتے" سب لوگ ہنسنے لگے بکریدی میاں کا سر نیچا ہو گیا۔ ان کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام دنیا ان کا مذاق اڑا رہی ہے وہ اپنی نظروں میں خود حقیر معلوم

ہونے لگے اور یہ سب کچھ شبراتی میاں کی وجہ سے ہوا۔ شبراتی میاں نے ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اسی کا بکریدی میاں کو بہت صدمہ تھا۔ پانی میں ڈوبتا ہوا انسان بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ دل کے پھپولے کو چھیڑ دیجئے وہ پھوٹ جائیں گے بکریدی میاں کب تک صبر کرتے تحصیلدار صاحب نے جو طعنہ مارا تو دل کی بھڑاس یہ کہکر نکال ہی دی" تحصیلدار صاحب آپ نے تو میرے لڑکے کو بہکا ہی لیا اب میں کس منہ سے اس سے کچھ کہہ سکتا ہوں اس نے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب تو منشا پورا ہو گیا لیکن مجھے کیا میں پکا آم ہوں آج نہ مرا کل مر گیا لیکن آپ بھی دیکھ لیجیے گا کہ آج سے امر پار پر تباہی آگئی جو لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہیں اور کارخانہ قائم ہونے کے لئے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں وہ بہت جلد روئیں گے۔ ابھی کارخانہ قائم بھی نہیں ہوا لیکن آج ہی سے اس گاؤں میں پھوٹ پڑ گئی بیٹا باپ سے جدا ہو گیا ابھی کیا ہے تو سہی اگر کارخانہ اس گاؤں کا نشان بھی نہ مٹا دے۔

مہاراج بولے بکریدی میاں بس بہت ہو چکا چپ بھی رہنے کو سنا اچھا نہیں ہوتا شبراتی بابا کو گھر لے جاؤ۔

شبراتی میاں بولے۔ بابا جانے دو ایسی باتیں نہیں

کیا کرو چلو گھر چلو۔

ٹھنگوا چمار بولا۔ میاں کا اپنے لڑکے پر تو بس نہیں چلیت (چلتا) اُلٹا ہم لوگن (لوگ) پر رسیات (غصہ) ہیں۔

بکریدی میاں کو ہر ایک کی بات زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوئی وہ وہاں سے کھسک گئے ان کو جاتے دیکھ کر سب لوگوں نے کہا باباسٹھیائے گئے ہیں "تحصیلدار اب ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے شبراتی میاں نے بھی ان کا ساتھ دیا بکریدی میاں جب گھر پہنچے تو اپنی بہو سے بولے "بیٹی میں اب اس گاؤں میں نہ رہوں گا حج کرنے جاؤں گا۔"

بہو خوش ہو گئی اس نے دل میں سوچا "اچھا ہو گا راہ سے کانٹا نکل جائے گا پھر تو میں ہی گھر کی مالکن بن جاؤں گی اپنا ہی راج ہو گا ابھی بڈھے کی وجہ سے تو میری کچھ چلتی نہیں (خوش ہو کر بولی) ہاں بابا حج تو ضرور کرنا چاہیئے .... ہمیں مکہ شریف سے زمزم کا پانی ضرور لائیے گا بکریدی میاں نے کوئی جواب نہ دیا سفر کی تیاری میں لگ گئے رات کو شبراتی میاں کی بیوی نے شبراتی سے کہا "اور سنا! بابا حج کرنے جارہے ہیں۔"

شبراتی نے جواب دیا" جانے دو ان کے بغیر یہاں کون کام رکا پڑا ہے خود تو کبھی مجھ سے کچھ پوچھتے نہیں اور اگر میں کسی سے کچھ کہتا سنتا ہوں تو جل جاتے ہیں اُن کی ہمیشہ سے یہی عادت رہی ہے میرا تو ناک میں دم آگیا ہے"

دو چار دن کے بعد بکریدی میاں حج کرنے چلے گئے رخصتی کے وقت وہ شبراتی میاں کو اپنی چھاتی سے لگا کر خوب روئے باپ بیٹے کا یہ آخری ملاپ تھا کیونکہ بکریدی میاں پھر جیتے جی کبھی گھر واپس نہ آئے۔

(۴)

امریا میں کارخانہ بننے لگا۔ لہلہاتے کھیتوں کی جگہ میدان اور عمارتیں نظر آنے لگیں مزدوروں کی بن آئی لیکن زمینداروں اور کاشتکاروں کی مصیبت آگئی آٹھ آنے مزدوری پر بھی کوئی مزدور کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا ایک روپیہ کارخانہ والے دیتے تھے ایسی حالت میں کوئی مزدور زمیندار یا کاشتکار کی کیوں پرواکرتا۔ مہاراج گنیشی نے دو چار مرتبہ اپنے اسامیوں کو کارخانہ میں کام کرنے سے روکنا چاہا اس پر کارخانے کے صاحب نے پولیس میں رپورٹ کرادی کہ امریا

کے زمینداراسرکاری کام میں مداخلت کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنیشی مہاراج کے علاوہ چودھری گھسیٹے اور شبراتی میاں پر بھی دار وغہ جی کی ڈانٹ پڑی پھر تو مزدور کھل کھیلے دبا ہوا مادہ پھوٹ نکلا زمینداروں کا رعب مزدوروں پر سے بالکل اُٹھ گیا کھیت کی نرائی تو درکنار اس کے کاٹنے والے بھی نہ ملے ایک دانہ اناج بھی گھر میں نہ آیا سب کھیت خراب ہو کر رہ گیا جن بکھاریوں میں اناج رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی وہ اب خالی پڑی رہنے لگیں شروع میں کارخانہ میں کام کرنے والوں کے رہنے کے لئے کوئی بارک وغیرہ نہیں بنی تھی ٹھیکیدار کے آدمی بابو منشی خلاصی وغیرہ امریا ہی میں کرایہ پر مکان لے کر رہنے لگے اس سے مہاراج گنیشی چودھری گھسیٹے اور ایسے ہی دو چار آدمیوں کو جن کے پاس بڑے بڑے مکانات تھے کچھ فائدہ ہوا خود تکلیف میں رہنے لگے لیکن روپیہ کے لالچ میں اپنے مکانوں میں کرایہ داروں کو ٹھہرا لیا مگر برسات جو آئی تو مکانوں کی مرمت کیلئے مزدور نہ ملے مکانات کچے تھے دھڑا دھڑ گرنے لگے اس سے زمینداروں کا بڑا نقصان ہوا مزدوروں کے بھی

مکانات گرے لیکن اُنھوں نے کوئی پرواہ نہ کی کیونکہ اس عرصہ میں کارخانہ افسر نے ان کے لئے پکی بارکیں بنوادی تھیں وہ اپنی جھونپڑیوں کو چھوڑ کر بارکوں میں منتقل ہو گئے خالی زمینوں کو ساہوکاروں نے خرید کر ان پر پکے عالیشان مکانات بنوا دئے اس آپادھاپی میں کاشتکاروں اور زمینداروں کا دیوالہ نکل گیا۔ سرمایہ داروں نے شروع میں تو ان کو قرض دیا اور پھر سود در سود کے جال میں پھنسا کر مکانات اور جائداد نیلام کرا دی اور خود ہی خرید کر مالک بن بیٹھے جوکھو کلوار کو خیال تھا کہ اس کو شراب کا ٹھیکہ ضرور مل جائے گا لیکن اس کے بجائے ایک مالدار کو مل گیا اور جوکھو اسی کے یہاں ملازم ہو گیا مگر نیت خراب تھی چوری اور غبن کے الزام میں سزا پا گیا پھابیر حلوائی اور ہر بجنا بنیا کا ہوائی قلعہ بھی مسمار ہو گیا باہر والوں کی آراستہ پیراستہ دوکانوں کے سامنے ان کو کوئی فروغ نہ ہوا کارخانہ کے ملازموں کو سودا سلف خریدنے کے لئے بہت دور جانا پڑتا تھا سرکار نے ان کے آرام کے لئے امریا ہی میں بازار بنوا دیا اور اس سے بھی پردیسیوں اور سرمایہ داروں ہی کا فائدہ ہوا گاؤں والوں کو

تو ہر طرح سے نقصان ہی ہوا۔ بازار کھلنے سے بڑی رونق ہوئی جس گاؤں میں کبھی خاموشی اور سکون کا عالم رہتا تھا اب شراب تاڑی گانجہ اور چرس وغیرہ کی دوکانیں کھلنے سے رات رات بھر راگ ورنگ کی محفلیں جمنے لگیں دو چار وید اور حکیم بھی باہر سے آدھمکے مریضوں کی بھرمار ہوگئی جو دیہاتی کبھی نیم کی سینکوں تلسی کی پتیوں اور کالی مرچ ہی سے بخار کھانسی میں اچھے ہو جاتے تھے اب حکیموں اور ویدوں کی دواؤں میں اپنا روپیہ برباد کرنے لگے گاؤں کا دھوبی پہلے سال بھر کپڑا دھوتا تھا اور اس کے بدلے میں دس پندرہ سیر اناج پاتا تھا اب دو پیسہ اور ایک آنہ کپڑے کی دھلائی لینے لگا ساہوکاروں کی پکی اور بلند عمارتیں جو تیار ہوئیں تو وہاں دو چار ڈیرہ دار طوائفیں اور بٹھرنیاں بھی آگئیں پھر تو وہ عالم ہوا کہ خدا کی پناہ پہلے گاؤں کی بہو بیٹیاں بے فکری سے کھیت کھلیان میں گھوم پھر سکتی تھیں لیکن اب ان کا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا ایک دن چودھری گھسیٹے کی بہو ہمارا جن کے ساتھ اپنے کسی پڑوسن کے یہاں جا رہی تھی ادھر سے کلالی خانہ کے کچھ اوباش خلاصی شراب پیتے جھومتے جھامتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے الا پنا شروع کیا۔

کہاں چلی جنیاں نیناں لڑا کے ______

بہو اور مہاراجن شرم کے مارے کٹ کٹ گئیں اور بھاگ کر اپنے گھروں میں گھس گئیں خلاصی آگے بڑھے تو شبراتی میاں کی بیوی کو دیکھا کہ اپنے دروازہ پر کھڑی ہی خلاصیوں کو شور و غل مچاتے دیکھ کر اُس نے جھٹ دروازہ بند کر لیا خلاصیوں نے پھر اپنی بے سری اڑائی۔

تیرے دیکھن کو راجہ ہم کب سے کھڑے
دن نہیں چیناں رات نہیں نندیا
جب سے سٹر کوا یہ نینا لڑے
تیرے دیکھن کو پیارے ہم کب سے کھڑے

شبراتی میاں ٹھیک اسی وقت اپنے گھر کی طرف کہیں سے آرہے تھے خلاصیوں کی بدتہذیبی پر اُن کو بڑا غصہ آیا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ خلاصیوں سے اُلجھ پڑے اِدھر وہ اس کے لئے پہلے ہی تیار تھے ایک خلاصی نے اُن کی ٹانگ پکڑی دوسرے نے اُن کی پگڑی اچھالی تیسرے نے سر پہ دھول جمائی اور چوتھے نے اُٹھا کر دے مارا شبراتی میاں کی ساری شیخی کرکری ہو گئی مہاراج اور گھسیٹے میاں بھی

موقع پڑ آ گئے لیکن سب کھڑے تماشہ ہی دیکھتے رہے اور خلاصی چلتے بنے پہلے کی طرح اتفاق ہوتا تو خلاصیوں کی جان کے لالے پڑ جاتے لیکن اب تو نفسی نفسی پڑی تھی غریبی اور افلاس نے ان کے جوش کو سرد اور ہمتوں کو پست کر دیا تھا شبراتی میاں نے شور وغل بہت مچایا لیکن "کون سنتا ہے فغانِ درویش" سرمایہ داروں نے خلاصیوں کا ساتھ دیا اور شبراتی میاں کا کچھ بھی بس نہ چلا اسی دن سے شریفوں کی اور بھی مٹی پلید ہو گئی لیکن رذیلوں کی ڈھاک بندھ گئی پھر تو وہ زمانہ بھی آ گیا کہ امیر غریب اور غریب امیر بن گئے چار پانچ سال کے اندر ہی امریا کی بالکل کایا پلٹ گئی جو کبھی گاؤں تھا اب اچھا خاصہ شہر ہو گیا کارخانہ میں مد ختم ہوتے ہی امریا کے مزدوروں کو بھی سرکار نے برطرف کر دیا سیکڑوں آدمی بھوکے دربدر پھرنے لگے جس کا جس طرف منھ سمایا بھاگ نکلا انقلاب زمانہ سے چودھری گھسیٹے مہاراج اور شبراتی میاں جو کبھی زمیندار تھے اب غلام بن گئے چودھری گھسیٹے کسی بنیئے کے یہاں ملازم ہو گئے مہاراج کا کام امیروں کی خوشامد اور اُن کی خیرات پر چلنے لگا شبراتی میاں کو ایک انگریز کے یہاں دس روپیہ ماہوار پر خدمتگاری

کی جگہ مل گئی ایک دن چودھری گھسیٹے مہاراج اور شبراتی میاں بیٹھے ہوئے اپنا پرانا زمانہ یاد کر رہے تھے مہاراج گنیشی نے شبراتی میاں سے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "تم کو بکریدی بابا کی باتیں یاد ہیں" شبراتی نے کوئی جواب نہ دیا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

نگار مئی ۲۹ء

شرابی

گاؤں میں بھروس کے دن اچھے گذر رہے تھے۔ مگر بیٹھے بٹھائے اسے لالچ نے گھیرا اور بال بچوں کو ساتھ لے کر شہر میں جا پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ شہر میں نوکری کا ملنا بہت آسان ہے مگر ایسا نہ ہوا بہت دن تک ٹھوکریں کھا کر بڑی مشکل سے اُسے مِل میں دس روپیہ ماہوار کی ایک جگہ ملی۔ اتنی قلیل تنخواہ میں دو چھوٹے چھوٹے بچے، بیوی، بوڑھی ماں اور ایک جوان لڑکی سندریا کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی میں بھروس کا کنبہ دو روپئے ماہوار کی ایک کوٹھری میں رہتا تھا۔ کہاں گاؤں کی کھلی فضا اور کہاں

بھردس کی تنگ کوٹھری، جہاں ہوا کا بھی مشکل سے گزر ہوتا تھا بچوں کی آنکھیں دکھنے لگیں، بدن میں پھوڑے اور پھنسیاں نکل آئیں، بوڑھی ماں بیمار ہو کر پرلوک سدھاری اور بیوی دائم المریض بن گئی گاؤں کی کمائی سے گھر میں دو چار چاندی کے جو گہنے تھے وہ ماں کی کریا کرم اور بیوی کے علاج میں بک گئے۔ اس کے ساتھ ہی مہاجن سے بھی قرض لینا پڑا۔ اب بھردس کو گاؤں چھوڑنے کا رنج ہوا۔ پھر بھی وہ اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ شہر میں وہ کمانے آیا تھا۔ خالی ہاتھ وہ گھر واپس جائے گا۔ تو گاؤں والے اُس کی ہنسی اُڑائیں گے۔

کچھ دن یونہی گذرے۔ غریب امیر بن گئے، لیکن بھردس کی حالت بدستور رہی، اس کے دُبلے بدن پر ویسی ہی میلی دھوتی اور پھٹی مرزئی تھی جیسے پہلے دکھائی دیتی تھی۔ ہاں ایک مدت سے برابر پانی میں پڑی رہنے سے ناؤ ضرور پُرانی ہو چلی تھی۔ اس کی عمر ڈھل رہی تھی، آنکھوں کی روشنی گھٹ گئی تھی، چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ سر اور مونچھوں کی سیاہی میں سفیدی دکھائی دینے لگی تھی۔ جس شاہراہ زندگی پر وہ پہلے گاؤں میں بڑی بے فکری سے چلا جاتا تھا۔ وہاں اب وہ ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

(۲)

سندریا کی بھی کیفیت بالکل اُسی مصیبت زدہ درخت کی سی تھی۔ جس کو گرمی کے صدمے سہتے سہتے برسات کی ابتدائی پھوار سے تسکین کی اُمید بندھنے بھی نہیں پاتی۔ کہ بجلی کا ایک ہی شعلہ جلاکر خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ مگر جوانی جوانی ہی ہوتی ہے جس طرح جوش پر آئی ہوئی ندی خس وخاشاک کو بہاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح سندریا کی جوانی، اس کا پھول کا سا معصوم حسن پھٹے پُرانے کپڑوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا۔ وہ اب اٹھارہویں سال میں تھی۔ جوانی کا ولولہ خیز زمانہ تھا۔ پرجوش محسوسات جو عہد طفلی میں سویا کرتے تھے۔ شورش انگیز قوتوں کو لئے ہوئے بیدار ہو چکے تھے۔ مگر اب تک اس کی کہیں شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس کا کوئی خریدار نہ تھا۔ صرف اس لئے کہ غریب بھگردس کے پاس دنیا پرست برادری کو کھلانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔

جب سندریا گھر سے پانی بھرنے نل پر جاتی تو محلہ کے شہدے آوارہ لڑکے اُسے چھیڑتے، مگر سندریا جوانی کے بوجھ سے دبی سر نیچا کئے جلدی سے گھر واپس آجاتی، افلاس

اور غربت نے اسے ڈرپوک بنا دیا تھا۔ اس میں جواب دینے کی ہمت ہی نہ تھی۔ شہر میں غریبوں کی عزت ہی کیا ہے بھردس صبح سے شام تک کولھو کے بیل کے مانند مِل میں کام کرتا تھا اسے تن بدن ہی کا ہوش نہ تھا۔ وہ سندریا کی خبر گیری کیا کرتا۔

ایک دن سندریا نے دبی زبان سے بھردس سے کہا بھی کہ "بابا! مجھے کہیں نوکری دلا دو۔ جب میں گھر سے نکلتی ہوں تو محلّہ کے لڑکے مجھے چھیڑتے ہیں۔"

گاؤں میں کوئی سندریا کو چھیڑتا تو بھردس اس کا خون پی لیتا۔ مگر شہر میں بھردس کی کوئی عزت نہ تھی۔ ملازمت نے اُسے بزدل اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ سندریا کی شکایت سن کر وہ صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتا۔

(۳)

پنڈت گیان چند شہر کے رُوسا میں شمار ہوتے تھے شہر والے انھیں نہایت پارسا، نیک اور شریف سمجھتے تھے، وہ ملکی اور قومی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ یتیم خانہ کے سکریٹری۔ کنیا پاٹ شالہ کے صدر اور دودھوا آشرم کے ٹرسٹی تھے بھردس ان کا کرایہ دار تھا۔ ایک دن اس نے

پنڈت جی کو اپنی بپتا سنائی اور سندریا کو اُن کے یہاں برتن مانجھنے کی دو روپئے ماہوار پر نوکری مل گئی۔

پنڈت جی کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور تھا۔ وہ جنس حسن کے مشتاق جوہری تھے۔ سندریا کو جوانی کے نشہ میں چور دیکھ کر وہ اپنی اصلیت پر اُتر آئے۔

اتوار کا دن تھا اور دوپہر کا وقت۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پنڈت جی اپنی بیٹھک میں بیٹھے تھے وہاں سے اُنھوں نے سندریا کو دیکھا۔ وہ اس وقت سر پر، پانی کی گاگر لئے گھر سے نکل رہی تھی۔ اس کے معصوم چہرہ پر شباب کی مستانہ ادائیں نثار ہو رہی تھیں۔ پنڈت جی ایسے شاطر شکاری نے مظلوم شکار کو بھاگنے کا موقع ہی نہ دیا۔

سندریا کو پنڈت جی کے یہاں کام کرتے یہ پانچواں دن تھا کہ وہ بجائے شام کے دوپہر ہی کو گھر واپس آ گئی۔ بال بکھرے، چہرہ تمتمایا اور آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے بھردس گھر ہی پر موجود تھا اس نے سُندریا سے پوچھا۔ "کیا ہوا آج اتنی جلدی کام سے کیسے واپس آ گئی؟"

سندریا نے کوئی جواب نہ دیا وہ کوٹھری میں گھس کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایں! یہ کیا ہوا. تیرے ہاتھوں کی چوڑیاں کیسے ٹوٹ گئیں۔ یہ کلائی پر چوٹ کیسے لگی؟ بتاتی کیوں نہیں؟" باپ نے پھر ڈانٹ کر پوچھا۔

بپّا! میں کل سے وہاں نہ جاؤں گی۔ زبردستی اُن سے اپنا پیچھا چھڑا کر آئی ہوں۔ سندریا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا....؟" بھروس گھبرا کر بولا اور پھر وہ ایک ہی لمحہ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن پھر...... پھر اس کو اپنی غریبی اور کمزوری کا خیال آگیا اور وہ آسمان کی طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"میں کل سے پانی بھرنے بھی نہ جاؤں گی"

"کیوں؟"

"محلّہ کے لڑکے بھی مجھے چھیڑتے ہیں اور بابا تم سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا"

بھروس کو آج پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اُس نے سندریا

کی اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ شادی کے لئے روپے
کہاں سے لائے۔ بھوکے بچے۔ بیمار بیوی۔ مہاجن کا قرض۔
وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ پرماتما نے اسے پیدا ہی کیوں
کیا تھا؟"

بھروس گھبرا کر گھر سے نکل کر ایسی جگہ پہنچا جہاں شرفا
جانے سے پرہیز کرتے ہیں اگر اس طرف نکلیں بھی تو ناک پر رومال
رکھ لیتے ہیں لیکن وہاں دنیا کے بدمعاشوں کا مجمع رہتا ہے جہاں
شوروغل میں بھی پریشاں حالوں کو سکون ملتا ہو۔

کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ بھروس شراب خانہ
میں گھسا، اس کی جیب میں صرف چار آنے تھے۔ اس نے
ایک کوزہ دیسی شراب کا مول لیا اور ایک ہی سانس میں
پی گیا ..... دوسرا لیا اور دنیا کا رنگ بدل گیا۔ اس میں
نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی ــــ وہ کیف شباب کی لہروں
میں ہچکولے کھانے لگا۔ اس کی تمام فکریں نہ جانے کہاں چلی
گئیں، اب نہ تو اسے بیمار بیوی کی فکر تھی اور نہ بھوکے بچوں
کی پرواہ۔ وہ گویا سندریا کو بالکل بھول گیا ــــ سندریا کی
بے عزتی کا اسے کچھ خیال ہی نہ رہا۔

وہ دوسرے دن بھی شراب خانہ میں پہنچا۔ تیسرے دن بھی ——— چوتھے دن بھی ——— اور اب سب اُسے شرابی کہتے ہیں۔

نندی

نندی اور بدل کا معمول تھا کہ وہ روزانہ جنگل میں جاکر ڈھور چرایا کرتے تھے وہیں وہ کھیلتے کودتے اور آپس میں گپ شپ اڑاتے ان کے پاک و معصوم دل دنیا کے جھگڑوں سے آزاد تھے انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی۔ نندی اور بدل کے گانو میں صرف ایک میل کا فرق تھا۔ صبح ہوتے ہی نندی اپنے گانو سے اور بدل اپنے گانو سے انگوچھے میں روٹی باندھ کر گائیں ہانکتے دیہاتی گیت گاتے جنگل کی طرف چل پڑتے جہاں وہ دن بھر ساتھ ساتھ مویشی چراتے اور شام ہوتے ہی اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے یہی ان کا دستور

تھا اور اسی میں ان کا لڑکپن گزر رہا تھا۔ شام کو دونوں میں بازی بدی جاتی کر دیکھیں کل صبح کو کون سب سے پہلے جنگل میں پہنچتا ہے۔

نندی کا باپ اپنے گانؤ کا ایک مشہور چمار تھا نندی اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی اس کی شادی کمسنی ہی میں ہو گئی تھی لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ بیوہ ہو گئی اب وہ چھ سال کی تھی اپنی بیوگی کا اُسے احساس بھی نہ تھا مویشی چرانا۔ ہنسنا کھیلنا اور اپنے والدین کا دل خوش کرنا بس یہی اس کا کام تھا۔ بدل اس کا لڑکپن کا ساتھی تھا وہ اس سے دو سال بڑا تھا اس کی زندگی بھی نندی سے ملتی جلتی تھی بدل کا باپ نندی کے باپ کی برادری ہی کا تھا بدل کی شادی بھی لڑکپن میں ہو کر ختم ہو چکی تھی اور اب وہ اسی میں خوش تھا۔

کھیل کود ہی میں چار سال گزر گئے اب بدل بارہ سال اور نندی دس سال کی تھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار رہے تھے اُن کو خواب میں بھی جدائی کا احتمال نہ تھا۔

دونوں سماجی ظلم وستم اور رسم ورواج کے شکار تھے۔

(۲)

نندی کے گاؤں میں ایک چمار کے یہاں برات آئی نندی بھی اپنے والدین کے ساتھ شادی میں شریک ہوئی جس کی وجہ سے وہ دو دن تک مویشی چرانے جنگل میں نہ جا سکی انھیں دونوں میں بدل کا برا حال ہوگیا پہلے دن جب نندی نہ آئی تو اُس نے سوچا۔ "کل نندی ضرور آئے گی" اس اُمید میں اُس نے دوسرے دن بہت سویرے جنگل کی راہ لی لیکن اس دن بھی نندی نہ آئی۔ آج نندی پر بدل کو بہت غصّہ آیا اُس نے سوچ لیا کہ جب نندی کا سامنا ہوگا تو وہ اُس سے ہرگز نہ بولے گا۔ اس کے بلانے پر بھی سیدھے منھ بات نہ کرے گا۔

دوسرے دن بدل جب جنگل پہنچا تو دور ہی سے اس کو نندی دکھائی پڑی بدل کو شادی کی باتیں سنانے کے لئے وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی لیکن بدل کا اُداس چہرہ دیکھ کر اُس نے پوچھا۔ بدل "تمھار جی کس ہے" (تمھارا جی کیسا ہے)

بدل نے تو سوچ رکھا تھا کہ وہ نندی سے بالکل نہ بولے گا لیکن اس کو دیکھتے ہی اپنا عہد بھول گیا اُس نے رُکھائی سے جواب دیا۔ "ہمرے جیو سے کو' و کا مطلب" (کسی کو ہمارے جی سے کیا مطلب ؟)

نندی نے تعجب سے کہا۔" بدل! آج مو سے ٹھیک سے کس نہیں بولت ہو؟ (مجھ سے اچھی طرح کیوں نہیں بولتے)

بدل نے جواب دیا۔" کا کری! کا ہم ہی ہیل کرا ہے۔ کا ہم ہی دو دن سے گھر بیٹھ رہن ہن" (کیا بتاؤں؟ کیا ہم نے ہی ہیل کی ہے کیا ہم ہی دو دن تک گھر میں بیٹھے رہے ہیں)

بدل کی ناراضگی کا مطلب اب نندی سمجھ گئی اُس نے ہنس کر کہا۔" ارے! تو ای کس نہیں کہت ہو کہ ہمرے نہ آنے
کیا کہتے آنے
سے کھسیائے گئے ہو۔ سیتل دادا کی بٹیا کا بیاہ رہا وہی کا دن
خفا تھا دن جب
نہیں آ سکیوں۔ تیسر یخوا کا ناچ کھوب بھا۔ رام دے تمہاری
آسکی تیسرے دن کا ناچ خوب ہوا
بڑی یاد آوت رہی۔ کل رات کو برات لوٹ گئی تو مو کا
مجھ کو
فرصت مل گئی۔ تو رسیائے کاہے گیو؟
روٹھ کیوں گیا

بدل بولا۔ کا کری نندی! تو رے بنا مور جی نہیں
کیا کروں تیرے بغیر
لاگیت رہا۔
لگتا تھا

تھوڑی دیر میں بدل پھر ہنس ہنس کر نندی سے باتیں کرنے لگا۔ دوپہر کی دھوپ میں دونوں نے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ایک ساتھ کھانا کھایا پھر برہا گانے لگے۔

(۳)

اس کے ایک مہینہ کے بعد کا ذکر ہے جنگل میں مویشی چرانے والے لڑکے اور لڑکیوں نے کوئی دیہاتی کھیل کھیلنے کا آپس میں مشورہ کیا۔ نندی اور بدل کو بھی اس میں شریک ہونے کے لئے کہا گیا لیکن بدل نے انکار کر دیا اور کہا۔ "ہم دونوں جنے الگ کھیلب تم لوگن کے ساتھ نہ کھیلبے" (ہم دونوں تمھارے ساتھ نہ کھیلیں گے) دوسرے لڑکوں کو اس کی یہ بات بُری معلوم ہوئی ایک لڑکے نے طعنہ مارا۔ "ہوں! الگ کھیلب! نندی کا سنگ بدل کبھوں نہیں چھوڑت با نو دونوں دولھا دولہن ہی تو ہیں"۔

نندی پاس ہی کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ "دولھا دلہن" کا لفظ سن کر وہ کچھ پریشان سی ہوگئی اس کا دل دھڑکنے لگا اس سے پہلے بھی اس نے اس لفظ کو کئی بار سنا تھا لیکن کبھی اس کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا تھا اس کے اندر

بدل کے درمیان ایسا رشتہ بھی ہو سکتا ہے اس کی طرف آج
پہلی مرتبہ اس کا دھیان گیا وہ دن بھر نہ جانے کیا کیا سوچتی
رہی اور جب شام کو گھر لوٹی تو اس نے ماں سے پوچھا "کاہے
مائی! دولہا دلھن کو ہوت ہیں"

یہ پہلا موقع تھا کہ نندی اپنی ماں سے ایسا سوال کیا اس
کی ماں کو سخت حیرت ہوئی مگر نندی کی معصومیت اور لڑکپن کا خیال
کر کے اس نے جواب دیا۔ نندی! دولہن اوکا کہت ہیں جون اپنے
دولہا کے سنگ رہے او کا روٹی پکا دے" ادھر بدل کے دل میں بھی
الجھن تھی اس نے گھر پہنچکر اپنے پڑوسی ماتا دین سے جو عمر میں اس سے بڑا تھا
"دولہا کی" فلاسفی دریافت کی۔ ماتا دین نے ہنس کر پوچھا "کا دولہا
بننے کا من ہے؟" "نہ بھیا! ایسے ہی پوچھت ہوں"
ماتا دین) - دت پاگل! دولہا او کا کہت ہیں جو اپنی دولہن
کے سنگ رہے اور پیسہ کوڑی کمائے اور دولھن کا دے"

یہ تو بالکل معمولی بات ہے یہ سمجھ کر بدل کی وحشت دور ہو گئی۔
دوسرے دن بدل اور نندی اسی جنگل میں پھر ملے۔
دونوں کے دلوں میں ایک عجیب قسم کے جذبات کا طوفان
آیا تھا لیکن ان جذبات کو زبان پر لانے کی ہمت کسی کو نہ تھی۔

دونوں میں لڑکپن تھا کئی گھنٹے تک وہ چپ چاپ ڈھور چراتے رہے۔ آخر شریر نندی سے نہ رہا گیا اور اُس نے کہا "کا سوچت ہو۔ آدٔ ہم دونوں جنے دولھا دلہن بن جائی"

نندی نے یہ بات بدل کے دل کی کہی تھی وہ بولا ٹھیک تو ہے لیکن اس معاملہ میں اُسے کئی باتوں کا ڈر معلوم ہوا اُس نے کہا "مُدا دولھا دُلہن تو ساتھ رہت ہیں۔ یہ کیسے ہوتی"

نادان نندی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ "ای کا مشکل ہے یہ سب ڈھور کام گئے ہیں کہ جنگل جر گوا ہے جیسے روج ساتھ ساتھ رہت ہے تو رہبے۔"

بدل نے کہا "تو ٹھیک ہے"

شادی کی بات طے ہو جانے پر ان کو اور کئی باتوں کا خیال آیا۔ نندی نے ایک شرط پیش کی کہ بیاہ میں "گڑ شہاری" سب کو تقسیم ہوتا ہے اس نے سیتل دادا کی لڑکی کے بیاہ میں گڑ شہاری کھایا تھا اس کے علاوہ بیاہ کی رسم ادا کرنے کے لئے ایک برہمن کی بھی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ کافی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ "شہاری" کا انتظام نندی کرے گی اور گڑ بدل لائے گا۔ برہمن کے لئے زیادہ پریشانی نہ اُٹھانی پڑی۔ بدل

کے گاؤں کے پنڈت کا لڑکا بھی ان کے ساتھ گائیں چرانے آیا کرتا تھا۔ اُس نے صرف دو آنے پر بیاہ کرانے اور اس کو پوشیدہ رکھنے کا ذمہ لے لیا۔ اُس نے اپنے پتا کے ساتھ اکثر شادیوں میں شرکت کی تھی۔ کچھ اونٹ پٹانگ منتر پڑھنا بھنور پھرانا اور بعد میں ٹکے وصول کرنا بس یہی شادی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن چکا تھا۔ اُسے کامل یقین تھا کہ وہ بدل اور نندی کی شادی کو نہایت خوبی سے سرانجام دے گا۔

دوسرے دن صبح ہی نندی نے اپنی ماں سے رو دھو کر بڑی مشکل سے آٹھ "سہاری" بنوائیں اور انھیں ایک کپڑے میں باندھ کر مویشی ہانکتی ہوئی بن کو چل پڑی۔ اِدھر بدل نے بھی کچھ اناج بیچ کر بنئے سے دو آنے پیسے اور کچھ گڑ حاصل کر لیا اور خوش خوش جنگل میں پہنچا وہاں برہمن کا لڑکا پہلے ہی سے موجود تھا۔ بدل کو دیکھ کر نندی نے پوچھا "گڑ لائے؟" برہمن لڑکے نے بھی سوال کیا "اور پیسے لائے؟"

بدل نے بڑے فخر سے گڑ اور پیسے دکھا دئے اور طعنہ کے ساتھ کہا "تو اپنی کہہ۔ سہاری لائی؟"

نندی نے جھک کر گال پُھلا کر سہاری کی پوٹلی کو اونچا

کر کے کہا۔ "یہ کا ہے؟ لے سونگھ لے" بیاہ کی پہلی کسوٹی پر دونوں کھرے نکلے۔

اب کس بات کی دیر تھی۔ سنسان جنگل میں ایک سبز پیڑ کے نیچے آم کی ایک ٹہنی زمین میں گاڑ کر نندی اور بدل آمنے سامنے بیٹھ گئے پروہت جی کچھ منھ ہی منھ میں بڑبڑائے گویا وہ منتر یا کوئی اشلوک پڑھ رہے ہیں بھونر پھرا کر پروہت جی نے اپنی سمجھ میں بدل اور نندی کو دولھا دُلھن بنا دیا اور اپنے دو آنے پیسے طلب کئے بدل نے بڑی ہوشیاری سے پنڈت جی کو چھ ہی پیسے پر ٹالا اور بچے ہوئے دو پیسے نندی کے ہاتھ پر رکھ کر وہ اپنے خیال میں شوہری فرض سے بھی ادا ہو گیا۔

نندی کے لئے وہ دو پیسے لاکھوں روپئے کے برابر تھے آج اس کی خوشی کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ اپنی گانٹھ میں پیسوں کو باندھ کر اُس نے بدل کے ساتھ "گڑ سہاری" کا بھوج کیا اور قدرتی چشمہ کا ٹھنڈا پانی پی کر پھر دونوں مویشی چرانے لگے۔

بیاہ کے رسومات بڑی سادگی سے ختم ہو گئیں۔

چار برس اور گزر گئے۔ نندی کے باپ کو اپنی "بال ودہوا" کنیا کی دوبارہ شادی کی فکر ہوئی۔ بدل اور نندی کے اچھے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے نندی کے باپ نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کی سگائی بدل ہی سے کرائے گا۔ بات چیت بھی پکی ہوگئی لیکن جب گانؤ کے مکھیا کو اس کی خبر ہوئی تو اُس نے نندی کے باپ کو منع کر دیا کہ وہ یہ رشتہ نہ کرے۔ کیوں ؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدل کے گانؤ کے مکھیا اور نندی کے گاؤں کے مکھیا میں پٹی داری تھی ان میں اکثر فوجداری ہوتی رہتی تھی پھر بھلا نندی کے گانؤ کے مکھیا کو یہ کب گوارہ ہوسکتا تھا کہ اُن کے دشمن کا چمار ان کے گانؤ پر برات چڑھا کر لائے۔ مجبوراً نندی کے باپ کو کسی دوسرے گانؤ میں رشتہ کرنا پڑا۔ یہ رسم و رواج کا کرشمہ نہ تھا بلکہ غریب اچھوتوں پر سرمایہ داری کی لعنت تھی۔

نندی کو یہ سب باتیں معلوم ہوگئیں وہ بدستور جنگل میں بھینسی چرانے جایا کرتی تھی لیکن شرم و لحاظ سے جس طرح پہلے وہ بدل کے ساتھ سگائی ہونے کی خبر بدل کو نہ سنا سکی تھی اسی طرح

جب یہ نسبت ٹوٹ گئی تو بھی وہ خاموش ہی رہی۔ بدل کو اپنی قسمت کا یہ بننا بگڑنا بالکل معلوم ہی نہ ہو سکا۔

خلافِ معمول ایک دن نندی جنگل میں نہ آئی بدل نے سوچا کسی خاص کام کی وجہ سے نہ آئی ہوگی لیکن جب دن پر دن گزرنے لگے اور نندی نہ آئی تب بدل سخت پریشان ہوا۔

اِدھر نندی کی شادی کی تاریخ قریب آگئی تھی اسی وجہ سے جنگل کا آنا جانا بند کر دیا گیا تھا۔ بدل کی جدائی میں نندی کا دل بہت اداس رہتا تھا۔ گھر میں منگل گیت۔ بچوں کی اچھل کود اور مردوں اور عورتوں کی چہل پہل اسے کچھ نہ بھاتی تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے کہ نندی کو گھر چھوٹنے کا غم ہے

برات آئی نندی کو وہ خوشی حاصل نہ ہو سکی جو چار سال پہلے اس سنسان جنگل میں پیڑ کے نیچے بدل کے ساتھ شادی ہونے سے ہوئی تھی۔ آج برات کے دن کھانے پینے میں نندی کو وہ لطف حاصل نہ ہوا جو چار برس پہلے پیڑ کے سایہ میں بیٹھ کر بدل کے ساتھ "گڑ سہاری" کھانے میں ملتا تھا منڈپ کے نیچے بھونر گھومتے وقت نندی کے پاؤں میں وہ تیزی نہ تھی جیسے پہلے آم کی شاخ کے چاروں

طرف بدل کے ساتھ گھومنے میں تھی۔ بڈھے پنڈت جی کے منتر اُس کے کانوں کو اتنے اچھے نہ معلوم ہوئے جیسے بچھ پیسے والے توتلے پنڈت کے لڑکے کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ۔ پہلی شادی اپنی مرضی سے کی تھی اور یہ شادی والدین اور زمیندار کے حکم سے ہو رہی تھی۔

بدل کو اس شادی کی کچھ خبر نہ تھی وہ مجبوراً جنگل میں آیا تو سہی لیکن اب اس کو کھیلنے کودنے میں کوئی دلچسپی نہ معلوم ہوتی وہ تنہائی میں بیٹھ کر نندی کی یاد میں آنسو بہاتا۔ جس دن نندی کا بیاہ تھا اس دن اس کا دل بہت بے چین تھا اس نے اب تک کسی کو اپنا ہمراز نہ بنایا تھا لیکن آج وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا اُس نے مجبوراً نندی کے گاؤں سے آنے والی ایک اہیرن کی لڑکی سے نندی کو کہلا بھیجا کہ آج شام کے وقت جس طرح سے بھی ہو سکے اس کو جنگل میں ملنا چاہیئے۔ کہاں؟ اسی پیڑ کے نیچے جہاں چار برس پہلے ان کی شادی ہو چکی تھی اور بدل کے دئے ہوئے پیسے بطور یادگار آج بھی نندی کے گلے میں تعویذ بنے ہوئے تھے۔

(۵)

وقت مقررہ پر نندی عروسی جوڑہ پہنے پاؤں میں مہاور اور مانگ میں سیندور لگائے بہت پوشیدہ طریقہ سے جنگل میں پہونچ گئی۔ بدل اس کا انتظار کر رہا تھا۔ عرصہ تک ایک دوسرے کو نہ دیکھنے سے وہ تڑپ رہے تھے۔ بدل نے نندی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور آج پہلی مرتبہ اس نے نندی کو اپنے کلیجہ سے لگایا۔ نندی نے اپنا سر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بدل کے کندھے پر رکھ دیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ ارمان و تمناؤں کے جذبات سے اس کا دل اچھل رہا تھا شرم و لحاظ کی لہریں اس کے رگوں میں دوڑ کر اُسے کپکپا رہی تھیں۔

ایک لمحہ کے لئے بدل بے خود سا ہو گیا لیکن فوراً ہی اس کو اپنا کندھا بھیگتا معلوم ہوا اور اس نے نندی کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرہ کو بغور دیکھا اور پھر گویا اس پر بجلی گری ہجوم جذبات سے اس نے نندی کو کلیجے سے لگا تو لیا تھا لیکن اس کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا اس نے اس کے عروسی جوڑے کی طرف کچھ دھیان ہی نہ دیا تھا۔ لیکن اب پاؤں میں مہاور

اور مانگ میں سیندور دیکھ کر چونک اُٹھا اور نندی سے ہٹ کر دور جا کھڑا ہوا اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ " ای کا نندی! (یہ کیا نندی ؟)

نندی اس کے جواب میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی وہ خود کو قصوروار سمجھتی تھی۔

بدل نے کانپتی ہوئی آواز سے پھر دریافت کیا " یہی بیڑ کے نیچے جون قرار کینوں رہا یاد ہے" (اس بیڑ کے نیچے جو قرار کیا تھا وہ یاد ہے)

نندی نے سر ہلا کر تسلیم کیا۔

بدل۔ یاد ہے تو بتاؤ مور کہا منہیو یاد ہے تو بتاؤ میرا کہنا مانوگی)

نندی نے پھر سر ہلا دیا جس کا مطلب تھا کہ" ہاں مانوں گی"

بدل اب بچہ نہ تھا نندی کی یہ محبت دیکھ کر جوش مسرت سے اس کا دل ناچ اُٹھا اس کے اُمیدوں کی خشک شاخ پھر ہری ہو گئی اس نے پھر ایک بار نندی کو جو اس کے خیال سے اس کی آج سے چار برس پہلے دھرم پتنی ہو چکی تھی کھینچ کر چھاتی سے لگا کر مہر محبت ثبت کر دی جس سے نندی کا چہرہ لال ہو گیا۔

تاریکی بڑھنے لگی اور اسی تاریکی میں نندی اور بدل آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے وہاں سے غائب ہو گئے۔

(۶)

نندی اور بدل کی گم شدگی سے تمام گاؤں میں ہل چل مچ گئی اِدھر اُدھر بہت تلاش کی گئی لیکن دونوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آئی ہوئی برات بگڑ کر واپس چلی گئی۔

بدل اپنے گانو سے نندی کو لے کر قریب کے ایک شہر میں پہونچا اور ایک وکیل صاحب کے اصطبل میں نوکر ہو گیا۔ والدین کے ڈر سے دونوں نے اپنی ذات چھپا رکھی تھی اتفاقاً ایک دن بدل کے گانو کا ایک اہیر اصطبل کی طرف سے نکلا اور اُس نے بدل کو پہچان لیا۔ بدل نے اپنے مالک سے کچھ دن کی چھٹی لے لی اور اہیر کو اپنا ہمراز بنا کر وطن کی طرف چلا۔ گانو کے قریب پہنچکر جنگل میں اسی پیڑ کے نیچے جہاں اُس کی شادی ہوئی تھی نندی کو ٹھہرا کر گانو میں گھسا جب اُس کے ضعیف باپ کو اُس کے آنے کی خبر ملی تو وہ خوشی کے آنسو بہاتا بدل کے پاس پہنچا۔ بات کی بات میں یہ خبر سارے گانو میں پھیل گئی۔ بدل چوپال میں بیٹھ گیا تھا گانو والے اُس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔

دو ڈھائی سال کے بچھڑے ہوئے لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر بڈھے باپ نے کہا۔ "چلو! بیٹا! اب گھر چلو؟" بدل نے شرماتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔ "دادا! مورے ساتھ تمھار بہو ہو ہے"

بڈھے کی خوشی دونی ہو گئی وہ بولا۔ "کون؟ نندی! کہاں ہے؟"

بدل نے اور بھی شرما کر کہا — اس کی گود میں ...."

وہ اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا صرف جنگل کی طرف اشارہ کر دیا۔ سب اسی طرف دوڑ پڑے۔

بدل کو گھر سے نکلے ڈھائی سال ہو چکے تھے اب نندی کی گود میں ایک ہنس مکھ بچہ بھی تھا۔ جب نندی اپنے سسرال پہنچی۔ تو اس کے دوسرے دن بدل کے باپ نے نندی کے باپ کو بھی اس کی خبر بھیج دی جو دوڑے ہوئے آئے۔ اس طرح سے بچھڑے ہوئے آپس میں مل گئے لیکن اُس سے برادری خوش نہ ہوئی اور بغیر بھوج کے وہ خوش بھی کس طرح ہو سکتی تھی ان کی نظروں میں تو بدل کا باپ کوئی معمولی باپ نہ تھا اسی وجہ سے برادری نے بدل کے

گھر کا حقہ پانی بند کر دیا تھا جب بدل نے اُن کو اپنی کمائی سے بھوج دیا تب جاکر کہیں برادری کا غصہ رفع ہوا اور پھر بدل کا خاندان برادری میں شامل کر لیا گیا ۔ اب برادری کی نظروں میں نندی اور بدل کی عزت بہت بڑھ گئی تھی ۔

خان بہادر

سید فصاحت حسین تھے تو انسپکٹر لیکن درجہ اول کی کوتوالی پر تعیناتی ہونے کی وجہ سے آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بنا دیئے گئے تھے۔ پولیس میں کانسٹبل کی حیثیت سے بھرتی ہوئے لیکن اپنی کارگزاری سے بیس سال کے عرصہ میں اس عہدہ پر پہنچ گئے پڑھے لکھے تو بہت کم تھے لیکن پھر بھی اپنے ماتحتوں پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے۔ جب سے انگریزی میں "یس" "نو" لکھنا اور بولنا سیکھ گئے تھے، اس وقت سے تو اور بھی اپنی قابلیت کے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وردی پہننے کا آپ کو بہت شوق تھا۔ شاید اس میں ان کی کوئی مصلحت

تھی ورنہ بیڈول ہونے کی وجہ سے جب وہ وردی پہن لیتے تو
اور بھی بُرے لگتے کبھی کبھی رشوت بھی لیتے تھے لیکن اس احتیاط
سے کہ حکام بالا تک اس کی خبر نہ پہنچنے پائے تحریک عدم تعاون
کے زمانے میں آپ نے نہایت استقلال سے کام لیا تھا جس سے
ان کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے حکام کی حضوری میں شاید
وہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے تھے کیونکہ روزہ نماز
سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا لیکن سرکار کی اتنی خیر خواہی پر بھی
بد قسمتی سے ان کو کوئی خطاب نہیں ملا تھا جس کا ان کو دلی قلق
تھا جب عدم تعاون کی تحریک مردہ ہو گئی تو کوتوال صاحب کو
اُمید ہوئی کہ اب وہ ضرور کوئی خطاب پا جائیں گے۔ جنوری کا
مہینہ جوں جوں قریب آتا جاتا تھا اُن کی بیتابی بڑھتی جاتی
تھی خطاب ملنے کے لالچ میں افسروں کا تو کیا ذکر وہ ان کے
خادموں کو بھی ڈالیاں نذر کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

(۲)

آج نوروز ہے۔ کوتوال صاحب حکام ضلع کی سلامی سے
فراغت پاکر اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر دراز حقہ پی رہے تھے
کہ یکایک کوتوالی کے چودھری یعنی دیوان جی کمرہ میں داخل ہوئے،

بڑے ادب سے "سلوٹ" کیا اور کہا حضور کو "خان بہادر" کا خطاب مبارک ہو۔ اتنا کہہ کر دیوان جی نے سرکاری گزٹ جس میں خطابات کی فہرست شایع ہوئی تھی کوتوال صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

کوتوال صاحب خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے اُنھوں نے گزٹ کو بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولے "کہاں لکھا ہے ـــ۔ دکھاؤ، دکھاؤ، مجھے جلدی دکھاؤ واللہ سرکار نے میرے ساتھ انصاف کیا مگر ٹھیرو۔ خوب یاد آیا میں انگریزی میں اتنا باریک خط نہیں پڑھ سکتا۔ میری عینک اس وقت میرے پاس نہیں ہے خدا جانے میں نے کہاں رکھ دی اور تم بھی تو انگریزی نہیں پڑھ سکتے خیر کوئی پرواہ نہیں کسی انگریزی داں دار دغہ جی کو فوراً بلاؤ"۔

کوتوال صاحب انتہائے مسرت سے پاگل ہو رہے تھے ان کی بدحواسی پر دیوان جی مسکراتے ہوئے انگریزی داں دار وغہ کو بلانے کمرہ سے باہر نکلے لیکن ابھی وہ دس قدم ہی گئے ہوں گے کہ کوتوال صاحب یہ کہتے ہوئے کمرہ سے نکل پڑے "دیوان جی ٹھیر دمیں گزٹ پڑھوانے کے لئے خود جا رہا ہوں کوتوال صاحب

دوڑتے ہوئے دیوان جی سے آگے نکل گئے جس عزت اور ادب سے اس وقت وہ گزٹ کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے شاید اس سے زیادہ وقعت سے کوتوال صاحب نے کلام پاک کو بھی نہ اٹھایا ہوگا۔ خدا خدا کرکے انگریزی داں داروغہ جی نے گزٹ پڑھا "خان بہادر" کا خطاب پانے والوں میں سید فصاحت حسین آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے "مبارک باشد" کی صدائیں آنے لگیں۔

جب دوستوں سے فرصت ملی تو کوتوال صاحب سیدھے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کے بنگلے پر پہنچے کوتوال صاحب ایک مرتبہ صبح کے وقت صاحب سے شہر کی خیر و عافیت کہہ آئے تھے صاحب نے خلاف معمول دوبارہ اپنے بنگلہ پر کوتوال صاحب کو دیکھ کر کہا ـــــــ

"کوتوال صاحب کیا بات ہے؟"

کوتوال صاحب نے تن کر "سلوٹ" کیا اور کہا حضور نے آج کا گزٹ نہیں ملاحظہ فرمایا۔ جس میں سرکار نے مجھے خان بہادری کا خطاب مرحمت فرمایا ہے"

صاحب بہادر "خان بہادر ہوگیا؟ ہم گزٹ نہیں دیکھ سکا۔

بڑا خوشی کا باٹ ہے۔

کوتوال صاحب۔ یہ سب حضور کی مہربانی اور سفارش کا اثر ہے جس کا میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

صاحب بہادر۔ نو۔ نو۔ ہمارا تھینکس کچھ نہیں۔ آپ گورنمنٹ کو تھینکس دے سکتا ہے۔ بہٹ اچھا خطاب ہے۔ ہم سچ بولتا ہے ہم نے تمہارا سفارش بھی سرکار سے نہیں کیا تھا۔"

کوتوال صاحب۔ ہمارے تو سرکار حضور ہی ہیں آپ نہ سفارش کرتے تو مجھے خطاب مل ہی نہیں سکتا تھا۔

صاحب بہادر۔ نہیں! نہیں۔ ہم سچ بولتا ہے ہم نے سفارش نہیں کیا تھا۔

کوتوال صاحب نے یقین نہ کیا انھوں نے سوچا حاکم لوگ ہیں خفیہ باتیں نہیں بتایا کرتے صاحب کو سلام کر کے جب کوتوالی واپس ہوئے اور اپنے گھر میں گئے تو بیگم صاحبہ نے بھی مبارک باد دی۔ کوتوال صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کڑک کر کہا۔" سنو بیگم مجھے کوئی معمولی خطاب نہیں ملا میری خواہش ہے کہ میں اس خوشی میں ایک دعوت کر دوں جس میں اپنے تمام حکام و احباب کو بلاؤں۔

بیگم صاحبہ نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔ اچھے آئے دعوت کرنے والے آپ کے تو دوست احباب سب آئیں لیکن میری سہلیاں کہاں جائیں۔

کوتوال صاحب۔ ارے تو میں نے منع کب کیا ہے اپنی سہیلیوں کو شوق سے بلاؤ۔ اب اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کون موقع ہو سکتا ہے۔

بیگم صاحبہ پھر بولیں "اچھا یہ تو بتایئے اس خطاب کے ساتھ سرکار آپ کو کتنا انعام دے گی"

کوتوال صاحب نے کہا بیش لگلی۔ کہیں خطاب میں روپیہ بھی ملتا ہے"

بیگم صاحبہ۔ "اگر روپیہ نہیں ملتا تو پھر کیا ملتا ہے"

کوتوال صاحب۔ "ایک سرٹیفکٹ اور شاید ایک تمغہ"

بیگم صاحبہ نے جھنجلا کر کہا "تو میں ایک کاغذ کے لئے اتنا ہلڑ تو نہ ہونے دوں گی۔ خالی خولی خطاب سے کیا ہوتا ہی"

کوتوال صاحب نے مسکرا کر کہا۔ تم ان باتوں کو کیا سمجھو۔ خطاب سے بڑی عزت اور شہرت ہوتی ہے خطاب کے لئے لوگ ہزاروں روپیہ برباد کر دیتے ہیں خطاب کا ملنا کوئی معمولی بات

نہیں ہے اب میری عزت سرکار میں بڑھ جائے گی لاٹ صاحب مجھے کرسی دیں گے " یہ کہہ کر کوتوال صاحب نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہا۔ خوشی کرو۔ خوشی۔ اب تم کو تمام دنیا " خان بہادرن " کہے گی اور مجھ کو خان بہادر "

(۳)

آج کوتوال صاحب کے یہاں حکام ضلع و رؤسا شہر کی دعوت ہے۔ کوتوال کے وسیع صحن میں بڑا عالی شان شامیانہ نصب کیا گیا ستونوں پر رنگین ریشمی کپڑا لپیٹا گیا اور جھاڑ فانوس سے شامیانہ کو زینت دی گئی۔ صدر دروازہ پر " خوش آمدید " کا سنہری تختہ لٹکایا گیا۔ کوتوال صاحب خود جلسہ کا انتظام کر رہے تھے اُن کے ساتھی خوشی میں ساتھ دینے والے اور مصیبت میں دشمن بن جانے والے کوتوال صاحب کے کچھ خوشامدی اہل کار بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بیچارے بیگاروں سے کام لے رہے تھے۔

ہندوستانی کھانوں کے علاوہ انگریزی کھانوں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا " شیمپین " " ایکسٹرا نمبر ا " کے علاوہ اور بھی کئی اقسام کی نفیس ولایتی شراب صاحب لوگوں کے لئے منگوائی گئی تھی۔ غرضیکہ کوتوال صاحب نے اس دعوت کے لئے اپنا روپیہ پانی

کی طرح بہا دیا تھا۔ شام کے وقت دعوت ہونے والی تھی قریباً دو بجے دن کے گزٹ آیا اس کو دیکھ کر کوتوال صاحب کو خیال گزرا کہ دیکھیں تو کہیں خطاب کے ساتھ میری ترقی بھی تو نہیں ہو گئی۔ اس خیال کے آتے ہی کوتوال صاحب نے فوراً انگریزی داں داروغہ جی کو بلانے کا حکم دیا۔

گزٹ اُردو میں بھی چھپتا ہے لیکن بڑے لوگ اُردو کا اخبار پڑھنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں شاید اسی خیال کو مدنظر رکھ کر کوتوال صاحب اُردو کا گزٹ نہیں منگواتے تھے لیکن ان کے ماتحت اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ کوتوال صاحب انگریزی نہیں جانتے وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ کوتوال صاحب انگریزی بھی جانتے ہیں انگریزی ہی گزٹ منگاتے تھے۔ بہرحال کوئی وجہ بھی ہو کوتوال صاحب اُردو کا گزٹ نہیں منگاتے تھے جب داروغہ جی آ گئے تو گزٹ کھول کر پڑھنے لگے پہلے صفحہ پر جلی قلم سے لکھا تھا۔ تصحیح

"گزشتہ گزٹ میں سید فصاحت حسین صاحب آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا نام غلطی سے "خان بہادر" کا خطاب پانے والوں کی فہرست میں درج ہو گیا تھا لہٰذا بذریعہ اس حکم کے اطلاع دی جاتی ہے کہ مناسب تصحیح کر لی جائے"۔

سچّی خوشی

الہ آباد کے قریب نگلا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ غریب مادھو اسی گانو میں کپڑا بننے کا کام کرتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی جھونپڑی گانو سے باہر تھی جس میں وہ اپنی پیاری بیوی سیتا کے ساتھ بڑی خوشی کے ساتھ رہتا تھا۔ مادھو کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اور اب اس کا دنیا میں سیتا کے سوا اور کوئی اپنا نہ تھا عورت شوہر کے لئے اطمینان اور راحت دل کا ایک چشمہ رواں ہے۔ چنانچہ سیتا کی سچّی محبت سے مادہو کا دل مسرت سے سرشار تھا۔ سیتا سوت کاتتی اور مادہو اس کا کپڑا بنتا۔ اس سے اُن کو دونوں وقت پیٹ بھر کے کھانا مل جاتا تھا۔ سیتا کے بدن پر

ایک بھی ثابت کپڑا نہ تھا۔ مادھو کے سر پر پھٹی پرانی پگڑی تھی۔ مگر اس کی ان کو کچھ پروا نہ تھی اگر کبھی کسی وقت فاقہ بھی ہو جاتا تو بھی وہ رنجیدہ نہ ہوتے۔ سیتا اپنی سُریلی آواز میں دیہاتی گیت گاتی اور مادھو اس کو سُن کر بہت خوش ہوتا۔ اسی طرح ان دونوں کے دن بڑی بے فکری سے گزر رہے تھے۔ مال دار پڑوسی ان غریبوں کی خوشی پر رشک کرتے تھے۔

جھونپڑی کی کئی سال سے مرمت نہ ہوئی تھی۔ دیواریں جا بجا شکستہ ہو گئی تھیں۔ چھپر پرانا ہو گیا تھا۔ برسات کا زمانہ قریب تھا ڈر تھا کہ اگر اس سال جھونپڑی کی مرمت نہ کی گئی تو وہ گر جائے گی۔

ایک دن سیتا نے مادھو سے کہا "اگر اس مرتبہ جھونپڑی کی مرمت نہ کرائی گئی تو سخت تکلیف ہو گی۔" مادھو نے مسکرا کر جواب دیا تکلیف کس بات کی؟ ہماری محبت کی دیوار تو دونوں پریمیوں کو اپنے سایہ میں آرام دینے کے لئے مضبوط کھڑی ہے۔"

سیتا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے مگر پھر بھی ہمیں اپنے پریم مندر کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔

مادھو نے اُداس ہو کر کہا۔ سیتا! گھر کا حال تو تم جانتی ہو

کہ کس مصیبت سے ہماری زندگی کے دن گزر رہے ہیں مرمت کے لئے خرچ کہاں سے آئے گا۔

سیتا۔ اس کے لیئے تو زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔ اس مہینے میں ہم ایک ہی وقت کھانا کھائیں۔ کبھی ستو اور کبھی سوکھی روٹی ہی پر گزارہ کریں۔ اس طریقہ سے جو کچھ بچے گا اُس سے جھونپڑی کی مرمت بہت آسانی سے ہو جائے گی۔ کہو تمہاری کیا مرضی ہے؟"

مادھو نے محبت بھری نظروں سے سیتا کو دیکھ کر کہا۔"اچھی بات ہی اگر تم عورت ہو کر مصیبت اُٹھانے کے لئے تیار ہو تو میں بھی راضی ہوں۔ جیسا تم کہو گی ویسا ہی کروں گا"!

(۲)

اسی طرح دونوں نے ایک مہینہ کاٹا۔ کام بھی اس مہینہ میں زیادہ کیا۔ بات چیت میں وقت نہ کھو کر سارے دن سوت کاتتی اور مادھو کپڑا بنتا۔ آہستہ آہستہ کچھ روپے جمع ہو گئے۔ بانس گھاس۔ پھونس اور رسّی وغیرہ جن جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب مہیا ہو گئیں۔ اساڑھ کا مہینہ آیا گاؤں کے نصیب جاگے اور وہ رشک گلزار بن گیا۔ لڑکے آم اور جامن کے پیڑوں کی رکھوالی کرنے لگے۔ عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر زندگی کے دل فریب

جلوے دکھانے لگے۔ مادھو کا جھونپڑا بھی تیار ہو گیا۔ اُسے چاروں طرف سے پھول اور سبزے نے ڈھک لیا جس دن جھونپڑے کا کام ختم ہوا۔ اسی دن کپڑے کا ایک تھان بھی تیار ہو گیا۔

مادھو نے سیتا سے کہا "ایک ہفتہ سے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا آج کپڑا بیچ کر جو دام ملیں گے اس میں کھانے کا سامان لے آؤں گا تم پکوان پکانا۔ سیتا! تیرا منہ کیسا سوکھ گیا ہے گلے کی ہڈی باہر نکل آئی ہے۔ چوڑیاں کلائی سے نکلی پڑتی ہیں۔ یہ کہکر مادھو نے فرطِ محبت سے سیتا کے دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا سیتا کی آنکھوں میں پریم رس لہریں مارنے لگا۔ مادھو کا دل نشۂ اُلفت سے سرشار ہو گیا۔

سیتا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مادھو نے کہا۔ "ہنسی میں یہ رونا کیسا؟"

سیتا "پران ناتھ! یہ خوشی کا رونا ہے۔ تم سا سوامی پاکر مجھے اس دکھ میں بھی سکھ ہے۔ خیر ان باتوں کو جانے دو۔ اب تم بازار جاؤ کپڑا بیچ کر کھانے پینے کی چیزیں خرید لاؤ۔ میں جب تک چولہا جلاتی ہوں"

مادھو۔ اب تو رات ہو گئی ہے۔ شاید کپڑا نہ بکے۔

سیتا۔ اچھا تو جانے دو۔ آج کی رات جس طرح سے ہو بسر کرد کل دیکھا جائے گا۔"

مادھو۔ کیا گھر میں ستو وغیرہ کچھ نہیں ؟

سیتا نے آہ بھر کر " نہیں کچھ بھی نہیں "۔

مادھو نے ہنس کر کہا " نہیں ہے تو کچھ پروا نہیں جس طرح سے اور رات بسر ہوتی تھی آج بھی بسر ہو جائے گی۔ آج تمہارا گانا سن کر میں رات گزار دوں گا "۔

سیتا۔ خالی پیٹ میں گانا اچھا نہیں لگتا۔

غرض کسی نہ کسی طرح رات گزر گئی۔ علی الصباح جب کہ ابھی تاروں کی چھاؤں باقی تھی، چاند دھندلی دھندلی شعاعیں ڈال رہا تھا۔ پرندے چہک رہے تھے۔ کسان کھیت میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مادھو اٹھا شاید اسے رات پھر اچھی طرح نیند نہیں آئی تھی۔ جب اچھی طرح سے دن نکل آیا تو مادھو بازار گیا خوش قسمتی سے کپڑا جلد بک گیا۔ مادھو نے کھانے پینے کی چیزیں خریدیں اور گھر واپس آگیا۔ سیتا نے آٹا دال لے کر جلدی سے کھانا پکانا شروع کر دیا اور مادھو باہر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر انتظار کر کے وہ رسوئی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور سیتا سے پوچھا !

سیتا مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ کتنی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا"؟

سیتا نے جواب دیا "اب کچھ دیر نہیں۔ جاؤ اشنان کر آؤ، اتنی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا"

(۳)

کھانا تیار ہو گیا۔ سیتا نے آسن بچھایا۔ اور تھالی میں بھوجن پروس کر رکھ دیا مگر مادھو کا کہیں پتہ نہ تھا وہ اب تک نہا کر واپس نہ آیا تھا۔ سیتا دروازہ پر کھڑی ہو گئی اور اُس کی راہ دیکھنے لگی سامنے سے ایک بڑھیا آتی ہوئی دکھائی دی وہ زار زار روتی تھی سیتا کا دل بھر آیا اس نے بڑی محبت سے بڑھیا سے پوچھا "مائی کیوں روتی ہو۔؟"

بڑھیا۔ بیٹی کیا پوچھتی ہو دو روز سے ایک کھیل بھی اڑ کر مُنہ میں نہیں گئی۔ بھوک سے مری جا رہی ہوں۔ گاؤں بھر میں بھیک مانگی مکھیا کے دروازہ پر گئی لیکن کسی نے میری حالت پر رحم نہیں کیا کوئی بھیک نہیں دیتا۔ ہائے موت بھی نہیں آتی۔ کہ اس مصیبت سے چھٹکارا پا جاؤں۔

سیتا رحم دل تھی وہ بھوک کی آگ سے، غربت کی مصیبت سے

بخوبی واقف تھی، وہ غریب تھی لیکن اس کا دل امیر تھا۔ بڑھیا کا حال سُن کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے بڑھیا سے محبت بھری آواز میں کہا "مائی تم میرے ہاں آؤ میں تمہیں کھانا کھلاؤں گی" بڑھیا دعا دیتی ہوئی اس کی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ مادہو کے لئے پرسا ہوا کھانا رکھا تھا۔ سیتا نے بڑھیا کو لے جاکر آسن پر بٹھا دیا۔ سیتا اس وقت یہ بھی بھول گئی تھی کہ مادہو بہت بھوکا ہے جب وہ کھانا مانگے گا تو کیا جواب دے گی۔ اُس نے اپنا اور مادہو کا کھانا بڑھیا کو کھلا دیا۔ جب بڑھیا خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا چکی تو وہ سیتا سے رخصت ہوگئی۔ چلتے وقت اُس نے یہ دعا دی "بیٹی تو ہمیشہ سکھی رہے بھگوان تجھے بنائے رکھے تو نے ایک بھوکی پیاسی بڑھیا کی جان بچائی تجھے کھانے پینے کی کمی نہ ہوگی تیرا سُہاگ ہمیشہ قائم رہے گا۔"

بڑھیا کے جانے کے بعد سیتا نے رسوئی میں جاکر دیکھا تو اب وہاں کچھ بھی کھانا نہیں بچا تھا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی "وہ بھوکے پیاسے آئیں گے تو کیا کہیں گے؟ اسی عرصہ میں مادھو آگیا۔ وہ اس وقت گا رہا تھا۔ اُس نے آواز دی "سیتا"! سیتا رسوئی سے اُٹھ کر مادہو کے پاس آگئی۔

مادھو نے پوچھا "کھانا تیار ہے؟" سیتا نے کوئی جواب نہ دیا

مادھو۔ "سیتا تم چپ کیوں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟

سیتا۔ کیا کہتے ہو"؟

مادھو"میں کہتا ہوں کہ بھوک کے مارے جان نکلی جا رہی ہے کیا ابھی تک کھانا تیار نہیں ہوا۔؟

سیتا۔ تیار تو ہو گیا تھا۔ مگر......

مادھو۔ مگر کیا؟ تم روتی کیوں ہو؟ مادھو نے آگے بڑھ کر سیتا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

سیتا۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے کیا تم معاف نہ کر دو گے؟

مادھو نے گھبرا کر کہا۔ "میری سمجھ میں تمھاری باتیں نہیں آتیں تم صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ معاملہ کیا ہے؟"

سیتا نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "جب میں کھانا پکا چکی تو دروازہ پر کھڑی ہو کر تمھاری راہ دیکھنے لگی اس وقت ایک غریب بڑھیا آئی جو بھوک کے مارے دور رہی تھی بیچاری سے چلا نہیں جاتا تھا اس کی حالت پر مجھے رحم آیا اور میں نے جو کچھ کھانا پکایا تھا اس کو کھلا دیا۔ کیا تم میری اس غلطی کو معاف کر دگے؟"

مادھو نے جوش مسرت میں سیتا کو چھاتی سے لگا لیا اور کہا

"سیتا! تم سچ مچ "سیتا جی" کی روح ہو اگر روح نہیں ہو تو اُن کا خون تمہاری رگوں میں ضرور دوڑ رہا ہے، شاباش ہے تمہارے دل کو آفریں ہے۔ تمہاری سخاوت پر۔ سیتا تم اس کو غلطی
اس قابل فخر غلطی پر میری جان قربان ہو۔ میں تمہاری غلطی پر اپنا سارا دھن قربان کرنے کو تیار ہوں۔ سیتا! تم نے ایک غریب بیوہ عورت کو خود بھوکا رہ کر کھانا کھلایا ہے اس سے بڑھ کر ہمارے لئے کوئی بات خوشی کی ہو سکتی ہے؟ اگر ہمارے ایک دن بھوکے رہنے سے کسی کی جان بچتی ہے تو ہم سے زیادہ کون خوش قسمت ہو سکتا ہے۔ سیتا اُٹھو منہ ہاتھ دھوؤ۔ میں بازار جا رہا ہوں مجھے کچھ کام ہے کراچی سے کوئی سیٹھ آیا ہے۔ اُس نے مجھے بلایا ہے۔

سیتا کے دل کو ڈھارس ہوئی۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کی جان و دل کا مالک اس کا سوامی اس سے خوش ہے وہ اس خوشی میں اپنی بھوک پیاس کو بھول گئی اور بولی اس گاؤں میں بھلا کون ہے جو سیٹھ ہے؟"

مادھو۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ جب میں ندی سے نہا کر گھر واپس آ رہا تھا تو راستے میں اُس سیٹھ کا نوکر ملا تھا وہ کہتا تھا کہ اگر اس گاؤں میں کوئی جُلاہے کا کام کرتا ہو تو اُس کو سیٹھ جی نے بلایا ہے

جب میں نے اس سے کہا کہ اس گاؤں میں تو میرے سوا اور کوئی اس کام کو نہیں کرتا تو اُس نے کہا کہ پھر تم ہی کسی وقت چلے آنا۔"

سیتا۔ "اچھا جاؤ جلدی چلے آنا۔"

(۴)

بھوکا پیاسا مادھو کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی بوسیدہ پگڑی سنبھالی اور بازار کی طرف چلا۔ اس وقت دھوپ تیز ہو گئی تھی بُھوک کے مارے اس سے چلا نہیں جاتا تھا جب مقام پر سیٹھ ٹھہرا ہوا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ سیٹھ کسی دوسرے گاؤں میں گیا ہوا ہے۔ شام تک واپس آئے گا۔ یہ سُن کر مادھو کو افسوس ہوا۔ اور وہاں سے سر جھکائے ہوئے گھر واپس ہوا۔ راستہ میں ایک شخص گھوڑے پر سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ گھوڑے کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔ اور گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ گھوڑا سوار کے قابو سے باہر ہو گیا تھا اور سوار گرا ہی چاہتا تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا سوار نے مدد کے لئے آواز دی۔ مادھو نے پہلے تو سوچا جانے دو کون اس جھگڑے میں پڑے مگر معاً خیال آیا کہ سیتا نے آج اپنی جان کی پروا نہ کر کے ایک غریب عورت کی جان بچائی ہے میں مرد ہو کر کیوں اس سے پیچھے رہوں۔ مجھے اس سوار کی جان ضرور

بچانی چاہیئے۔ ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے اگر اس سوار کی جان بچانے میں میری جان چلی جائے تو کوئی پرواہ نہیں۔ یہ سوچ کر مادھو گھوڑے کی طرف لپکا۔ گھوڑا مادھو کو یکبارگی سامنے آتے دیکھ کر جھجکا اس موقع کو مادھو نے ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنی جان کی پروانہ کر کے اُس نے بڑی جرأت سے آگے بڑھ کر جلدی سے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ گھوڑے نے ٹاپ ماری لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اتنا موقعہ پاکر سوار گھوڑے سے کود پڑا اور گھوڑا کھڑا ہو گیا۔ اس عرصہ میں گاؤں کے اور بھی بہت سے لوگ وہاں پر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

سوار نے مادھو سے کہا "تم نے میری جان بچائی ہے۔ بڑی بہادری کا کام کیا ہے۔ میں تمھارے اس احسان کو عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ کیا تم اسی گاؤں میں رہتے ہو؟"

مادھو۔ "جی ہاں!"

سوار۔ تمھارا کیا نام ہے؟"

مادھو نے اپنا نام بتایا۔

سوار۔ کیا کام کرتے ہو؟

مادھو۔ میں کپڑا بنتا ہوں۔

سوار۔ اوہو! بڑی خوشی کی بات ہے مجھے ایسے ایک آدمی کی ضرورت تھی میں کل تم کو بلاؤں گا۔ تم مجھ سے ضرور ملنا۔ مادھو سوار سے رخصت ہوکر اپنے گھر آیا۔ سیتا اس کے انتظار میں دروازہ پر کھڑی تھی اس نے پوچھا "کیوں سیٹھ جی سے ملاقات ہوئی؟"

مادھو نے اداس ہوکر جواب دیا۔ نہیں" اس کے بعد مادھو نے سوار والے واقعہ کا سیتا سے ذکر کیا جس کو وہ سن کر بہت خوش ہوئی اس دن بھی دونوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوا دوسرے دن صبح کو سیتا نے کہا "آج بھی گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے کپڑا بننے سے جو کچھ روپیہ ملا تھا اس میں سے کل کچھ سودا آیا باقی روپیہ سوت کے لئے رکھا ہے اگر اس کو بھی خرچ کر ڈالیں گے تو کپڑا کیسے بنا جائے گا کیا آج بھی بھوکا رہنا پڑے گا؟"

مادھو نے ہنس کر کہا "دیکھا جائے گا۔ اچھا پہلے روپیہ لاؤ بازار سے جاکر سوت خرید لاؤں۔ مالک نے چاہا تو کھانے کا بھی کچھ انتظام ہو جائے گا" اسی وقت کسی نے باہر سے آواز دی۔ سیتا نے کہا "دیکھو کوئی تم کو بلاتا ہے" مادھو نے باہر نکل کر دیکھا کہ جس آدمی نے اس کو سیٹھ کے پاس بلایا تھا وہی ہے۔

مادھو نے کہا "کہئے کیا حکم ہے؟"

اُس آدمی نے کہا۔ چلئے آپ کو سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

مادھو جب سیٹھ جی کے پاس پہنچا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ سیٹھ وہی سوار ہے جس کی اُس نے کل جان بچائی تھی۔ سیٹھ جی نے بڑی عزت سے مادھو کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔" میں نے تمہارا سب حال معلوم کر لیا ہے مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو گاؤں گاؤں پھر کر جلاہوں سے کپڑا خریدے اور اس کو کراچی بھیجے۔ تھوڑے دن تک تو پھیری کی ضرورت ہے لیکن جب سب جلاہوں کو معلوم ہو جائے گا تو وہ اسی گاؤں میں خود آکر مال دے جایا کریں گے مجھے تم سے زیادہ ایماندار اور اچھا آدمی کوئی نہیں ملے گا۔ تم اگر میری طرف سے یہ کام کر دو گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اس کام کے علاوہ اس گاؤں میں ایک کپڑے کی دوکان بھی کھولنا چاہتا ہوں۔ اس کا بھی انتظام تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔ فی الحال میں تمھیں اس خدمت کے لئے سو روپیہ ماہوار دوں گا۔ جب کام چل جائے گا تو اور بھی ترقی دوں گا۔ تمھیں اس کام میں جتنے نوکروں کی ضرورت پڑے گی اُن کی بھی تنخواہ میں دوں گا تم کل ہی سے کام شروع کر سکتے ہو۔ کراچی جاکر میں کپڑا بھی بھیج دوں گا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ دن

چل کر میرے ساتھ کراچی میں کام سیکھ لو۔ تو بہتر ہو گا۔ تم نے کل جس طرح اپنی جان کی پروانہ کر کے میری جان بچائی ہے اس کا احسان عمر بھر نہیں بھول سکتا اس کا ہدیہ میں دینے کے لایق نہیں ہوں۔"

مادھو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے اُس نے ہاتھ جوڑ کر کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا" آپ کا جو حکم" اس کے آگے اس سے بولا نہ گیا چلتے وقت سیٹھ جی نے سو روپیہ مادھو کو دے کر کہا" تمھاری کل کی بہادری کا یہ انعام ہے اب تم جا سکتے ہو" شکریہ میں مادھو کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ وہ سیٹھ جی کو سلام کر کے رخصت ہوا۔ بازار سے اُس نے کچھ مٹھائی اور کھانے پینے کا سامان خریدا۔ سیتا کے لئے اور اپنے لئے ایک جوڑا دھوتی کا لیا اور خوشی خوشی گھر پہنچا۔ کھانے پینے کا سامان ایک طرف رکھ کر مادھو نے مٹھائی کا دونہ سیتا کے سامنے رکھ دیا اور ہنس کر کہا" لو ذرا سی مٹھائی کھا لو۔ تم نے دو روز سے کچھ نہیں کھایا ہے آج ایک خوش خبری سناؤں گا۔

سیتا نے مسکرا کر کہا" کہیں سے آج ڈاکہ مار کے یہ سب سامان لائے ہو کیا؟"

مادھو نے باقی ماندہ روپیہ جو دھوتی اور سودا خریدنے

سے بچا تھا سیتا کے سامنے رکھ کر کہا " اور یہ بھی اسی ڈاکر کا مال ہے "

روپیہ کو دیکھ کر سیتا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے کہا " سچ کہو یہ کیا معاملہ ہے؟ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مادھو نے تمام حال سنا کر کہا یہ سب تمھاری کرنی کا پھل ہے تو نے کل ایک غریب بیوہ عورت کو مرنے سے بچایا ہے بھگوان نے اس کا انعام دیا ہے۔

سیتا نے کہا " یہ کیوں نہیں کہتے کہ بھگوان نے ہم پر دیا کی ہے "

مادھو۔ اب تم اس کو جو جی چاہے کہو۔ ایک ہی بات ہے لیکن سیتا مجھ کو تمھاری یہ پرانی دھوتی اس وقت بہت بری معلوم ہوتی ہے بازار سے آج ایک نئی دھوتی خرید لایا ہوں اُٹھو اس کو پہن لو "

سیتا نے اشنان کر کے نئی دھوتی پہنی مادھو نے اپنی پُرانی بوسیدہ دھوتی کے بجائے نئی دھوتی کو پہنا۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر مٹھائی کھائی اس کے بعد مُنھ ہاتھ دھو کر جب وہ اپنے راحت کدے کے دروازے پر بیٹھ کر جنگل کی ہوا کھانے

سید پور جانے کا اتفاق ہی نہ ہوا ۔ پہلے اُن کے گاؤں کے قریب کوئی ریلوے اسٹیشن نہ تھا مگر اب وہ رام چورا روڈ اسٹیشن سے جو اُن کے گاؤں سے قریب ہی تھا سیدھے الٰہ آباد چلے جاتے تھے ، سید پور کی طرف سے جانے میں تکلیف کے ساتھ زیادہ خرچ بھی پڑتا تھا ۔

چالیس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا ، زمانے میں سیکڑوں انقلابات ہوئے ، بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے ، گاؤں اجڑے اور شہر بس گئے ۔ پُرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب نے لی ، اب شبراتی میاں کی ضعیفی کا زمانہ تھا ۔ اب غیروں کا کیا ذکر انھیں کی اولاد اُن ہی کے سامنے کہا کرتی تھی کہ " بابا سٹھیا گئے ہیں " شبراتی میاں سب کچھ سُنتے تھے دیکھتے تھے مگر دم بخود تھے ۔ گو ساٹھ سے زیادہ اُن کی عمر ہو چکی تھی پھر بھی ان میں موجودہ زمانے کے نوجوانوں سے زیادہ دم خم تھا ۔ نہ تو وہ عینک لگاتے تھے اور نہ اُن کی سماعت میں کوئی فرق آیا تھا ۔ دانتوں میں پائریا کا بھی روگ نہ تھا ۔ مزے سے آسانی کے ساتھ چبا چبا کر گاؤں کے نوجوان لڑکوں کی کمزوری پر لطیف پیرایہ میں مذاق اُڑایا کرتے تھے " یہ آج کل کے لڑکن ، لڑکوں ، کا تو پھونک مار دیو ہوا

میں اُڑ جائیں ...... میں جب جوان رہوں (تھا) تو بھینسہ کا
ایک گھونسہ مان گرائے دیون رہا۔ بڑی بڑی کشتی ماریوں رہا۔
(زمین گرا دیا تھا) (مارا تھا)
تم ایسن کا تو میں ابھو کافی ہوں
(تمہارے ایسے نوجوانوں کے لئے تو میں اب بھی کافی ہوں) ......
نوجوان لڑکے شبراتی میاں کی باتیں سن کر آپس میں
کہا کرتے تھے کہ بڈھے کو اب ڈینگ مارنے اور گپ اڑانے
کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ان کے گاؤں میں ایک لڑکا بی۔اے
پاس کر چکا تھا وہ کہتا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے "وہ دن ہوا ہوئے
کہ پسینہ گلاب تھا" اب جسمانی قوت نہیں بلکہ دماغی طاقت
کی زیادہ ضرورت ہے، یہ بڈھے تو زمین کے لئے بوجھ ہو رہے
ہیں، فوج میں جہاں کوئی گھوڑا پندرہ سال کا ہوا اور اُسے
"ضعیف و ناکارہ" کہہ کر گولی مار دیا جاتا ہے۔ یہ کساد بازاری
کا زمانہ ہے اقتصادیات کا تو یہی تقاضہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو
گورنمنٹ اس قسم کا قانون بنا کر ضعیفوں اور ناکاروں سے دنیا کو
صاف کر دے۔ گریجویٹ کی منطق گاؤں کے لڑکے نہ سمجھ کر بھی
ہاں میں ہاں ملا دیتے لیکن شبراتی میاں کا خیال تھا کہ آج کل
کے نوجوان تو بس اس قابل ہیں کہ کھیت کھلیان کے بجائے
گرہستی کا کام لیا جائے، یا ان سے چرخہ کتایا جائے، ممکن ہے

کہ وہ شہر جاکر کرسی پر بیٹھ کر "گِٹ پِٹ" کریں۔ لیکن ہل چلانا اور کھیتی باڑی کا کام کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ نوجوانوں کے ساتھ بڈھے شبراتی میاں کی چھیڑ چھاڑ میں، گانو والوں کو بہت مزہ آتا تھا۔ اس ضعیفی میں شبراتی میاں گانو کے مکھیا ہوتے ہوئے بھی کھیتی باڑی کا کام خود کرتے تھے۔ ان کے بیٹے اور پوتے اِن کاموں سے دُور بھاگتے تھے۔

شادی ہو یا غمی شبراتی میاں پیش پیش رہتے تھے، کسی کو ان کے مشورہ کی ضرورت ہو یا نہ ہو مگر شبراتی میاں ہمیشہ اپنا مشورہ دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ بلاتکلّف کہہ دیتے تھے کسی کو اچھا لگے یا بُرا اُن کی بلا جانے اُن کے ہم عمر تو شبراتی میاں کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے لیکن گانو کے لڑکے ظاہر میں تو نہیں لیکن باطن میں ان کی باتوں کو بوڑھے کی بکواس سمجھتے تھے۔

———— ۲ ————

دن یوں ہی گزر رہے تھے کہ ایک مرتبہ اتفاق سے شبراتی میاں کا گزر سید پور کی طرف ہو گیا۔ پہلے ریلوے لائن سید پور سے گزرتی تھی لیکن، اب وہاں ریلوے اسٹیشن بھی بن

گیا تھا۔ جب ٹرین سید پور میں رُکی اور قلی نے پکارا "سید پور اسٹیشن" تو شبراتی میاں اونگھتے ہوئے چونک پڑے۔ کیا دنیا بالکل بدل گئی، سید پور! وہی سید پور نا! جہاں اُنھوں نے اپنی نوجوانی کا کافی زمانہ گزارا تھا۔ وہاں کے باغوں میں آم اور جامن کی بہاریں دیکھی تھیں، چالیس سال کے گزرے واقعات اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرنے لگے اُن کے دلی دوست نجف اشرف عرف نجّن میاں یاد آ گئے، وہی نجّن میاں جنھوں نے کبھی شبراتی میاں کو بغیر کھلائے پلائے اپنے گاؤں سے گزرنے نہیں دیا تھا۔ جب نجّن میاں کو معلوم ہوگا کہ شبراتی میاں سید پور پہنچ کر بھی اُن سے ملے بغیر چلے گئے تو اُن کو دلی قلق ہوگا آج کی رات سید پور ہی میں کیوں نہ ٹھہر جائیں، صبح کو گاڑی سے چلے جائیں گے۔ وقت کم تھا زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا، چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹرین زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتی۔ سید پور اور وہاں کے قدیمی احباب کی محبت نے زور مارا اور شبراتی میاں نے پیٹھ پر اپنی چھوٹی سی گٹھری باندھی، ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالا اور اسٹیشن پر اُتر پڑے۔

سورج ڈوب رہا تھا، گائیں اور بھینسیں چراگاہوں سے

واپس آ رہی تھیں، کندھے پر الہ آبادی "لوہ بندی" لاٹھی رکھے اہیر مویشیوں کے پیچھے "برہا" گاتے چلے آ رہے تھے، یہ "گلی ڈنڈا" کھیلنے کا وقت تھا مگر اس کے بجائے شبراتی میاں نے دیکھا کہ کچھ لڑکے قمیص اور نیکر پہنے ایک میدان میں فٹ بال کھیل رہے ہیں، دو تین لڑکے پتنگ بھی اُڑا رہے تھے، شبراتی میاں نے جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھا تو انھیں دنیا بدلی نظر آئی، ایک معمولی گاؤں کے بجائے اب سید پور ایک متمول قصبہ تھا۔ شبراتی میاں کو خیال گزرا کہ شاید وہ سید پور کے بجائے کسی اور قصبہ میں آ گئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک قلی سے دریافت کیا "کاہو (کیوں) یہ سید پور ہی نا؟ جہاں سید میاں کا مجار (مزار) ہے؟" قلی نے کہا "ہاں بڑے میاں! یہی سید پور ہے، وہ سامنے سید میاں کا مزار ہے، اور اس کے پاس وہ کٹی ہے، کیا آپ میاں پہلے کبھی نہیں آئے؟"

شبراتی میاں کو قلی کی باتیں اچھی نہ معلوم ہوئیں، جہاں اُنھوں نے اپنی جوانی کا کافی وقت گزارا اُسی جگہ کے متعلق اُن پر اجنبیت کا الزام دینا اُنھیں ناگوار گزرا۔ اب شبراتی میاں اسٹیشن سے باہر نکلے اور اپنے دوست نجن میاں سے ملنے کی خوشی

میں اُن کے قدم جلد جلد آگے بڑھنے لگے، اُفوہ چالیس سال کے بعد آج ملاقات ہوگی، نجن میاں اُن کو دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے، اُن کی عمر بھی اب میری ہی ایسی ہوگی، شکایت تو کریں گے کہ اتنے دنوں تک ملاقات کیوں نہیں کی، تو یہی شکایت تو میں بھی اُن سے کر سکتا ہوں، پہلے تو اُن کے پاس ایک بھینس تھی اور ایک ہل کی کھیتی ہوتی تھی، اب تو کئی ہل کی کھیتی کرتے ہوں گے اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے شبراتی میاں چلتے چلتے ایک دو منزلہ عالی شان مکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شبراتی میاں اپنے دوست کا مکان بھول جائیں۔ یہ بیل کا درخت ہی، یہ کنواں بھی رہا، اسی کے پاس نجن میاں کا تو کچا مکان تھا، مگر یہاں تو آج پکے مکانوں کے سوا کچے مکان کم دکھائی دیتے ہیں۔ پہلے دروازوں پر ہر وقت چہل پہل رہتی تھی، ہر طرف زندگی کا ثبوت ملتا تھا۔ لیکن اب تو چاروں طرف سناٹا ہی۔

(۳)

گانو میں گھستے ہی شبراتی میاں نے ہر شخص سے "سلام علیکم" کہا، وہ سمجھتے تھے کہ پہلے کی طرح اس کے جواب میں لوگ اُن سے

بغلگیر ہو جائیں گے، مگر نوجوانوں نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ شبراتی میاں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے، ہاں ضعیفوں نے شبراتی میاں کے سلام کا ضرور جواب دیا، کیا گاؤں کے ساتھ ہی گاؤں والوں کی ذہنیت بھی تبدیل ہو گئی۔ شبراتی میاں کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، شام کی تاریکی بڑھ رہی تھی، دن رات سے گلے مل رہا تھا اور شبراتی میاں کو اب تک نجن میاں کا مکان نہ ملا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے دوست نجن میاں کا مکان بہت جلد پالیں گے، ایسے قلبی دوست کے مکان کا کسی سے پتہ دریافت کرنا وہ اپنے تعلقات کی توہین سمجھتے تھے۔ ان کے خیال سے جہاں نجن میاں کا مکان ہونا چاہیئے وہاں اب ایک عالی شان حویلی تھی۔ بیٹھک میں کرسیاں، میز، پلنگ اور تخت تو نظر پڑے لیکن وہاں کوئی انسان نہ دکھائی دیا جس سے وہ نجن میاں کا پتہ دریافت کرتے۔ اب شبراتی میاں زیادہ دیر تک حویلی کے سامنے کھڑے نہ رہ سکے۔ اتفاق سے ایک نوجوان عینک لگائے حویلی کی بیٹھک میں آیا۔ اس کو دیکھ کر شبراتی میاں نے رکتے رکتے دریافت کیا "کا ہوا (کیوں بیٹا) نجن میاں کا کون گھر ہے؟" نوجوان نے

ایک دفعہ شبراتی میاں کی ہیئت کذائی کو دیکھا اور کہا "آگے جاؤ" شبراتی میاں کو یاد آیا کہ نجن میاں کا گھر تو گانو کے اسی سرے پر تھا اب آگے کہاں جاؤں، پھر سوچا کہ ممکن ہے اب ان کا گھر گانو کے اندر بن گیا ہو، چنانچہ وہ آگے بڑھے۔ تھوڑی دور چل کر وہ ایک دروازے کے سامنے پھر کھڑے ہو گئے، انھیں یاد آیا کہ یہیں کہیں پر تو مینڈو میاں کا بھی گھر تھا۔ مینڈو میاں سے بھی شبراتی میاں کی جان پہچان تھی، مگر مینڈو میاں کا بھی تو کچا مکان تھا، لیکن اب تو نہایت پختہ عمارت کھڑی تھی۔ بیٹھک میں دو چار لڑکے بیٹھے تھے۔ شبراتی میاں کو خوشی ہوئی کہ ایسی بیٹھک تو ملی جو آباد ہے، گلی میں کھڑے ہو کر انھوں نے نجن میاں کو پوچھا۔ ایک لڑکے نے شبراتی میاں کو جھڑک دیا "بابا! شور کیوں مچاتے ہو ہم بہرے نہیں ہیں، آگے جاؤ" شبراتی میاں کا جی تو چاہا کہ لڑکے کو گستاخی کا مزہ چکھا دیں مگر یہ سوچ کر کہ بچے ہیں خاموش ہو گئے۔ ان کو اس بات کا بہت تعجب تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے، کیا ان کے سب ملنے والے گانو کے اس سرے کو چھوڑ کر دوسرے سرے پر جا کر بس گئے ہیں۔

اب تاریکی کافی پھیل چکی تھی، اندر گھروں کے تو چراغ

جلتے معلوم ہوئے لیکن دروازے یا بیٹھکیں بے چراغ تھیں شبراتی میاں کے لئے یہ بالکل نئی بات تھی، چالیس سال پہلے بیٹھکوں میں لالٹین نہ سہی مگر رینڈی کے تیل کا دیا ضرور جلتا تھا، غریب ہو یا امیر مغرب کی اذان ہوئی اور عورتوں اور بڈھوں نے چلّانا شروع کر دیا کہ جلدی چراغ جلادو، جلدی جاؤ بیٹھک میں دیا جلا آؤ۔ مغرب کی اذان کے بعد بھی اگر کسی گھر یا بیٹھک میں چراغ نہیں جلتا تھا تو وہ گھر اور گھر والے منحوس مکھی چوس سمجھے جاتے تھے۔ تو کیا سید پور میں منحوسیت نے قبضہ جما لیا ہے۔ شبراتی میاں کی عقل حیران تھی، خیریت یہ ہوئی کہ شبراتی میاں کو اب بھی کچّے مکانوں کی بیٹھکوں میں چراغ جلے نظر آئے ورنہ وہ سید پور کو شہر خموشاں سمجھ لیتے۔ اگر رات نہ ہو گئی ہوتی تو شاید شبراتی میاں اب بغیر کسی سے کچھ پوچھے اپنے گھر واپس ہونے کے لئے اسٹیشن چلے جاتے، لیکن ان کو اشتیاق تھا کہ جب سید پور آگئے ہیں تو اپنے دوستوں کا تو پتہ چلالیں۔ اتفاق سے اُنھوں نے جس دروازے پر جاکر دریافت کیا اُن کو یہی جواب ملا کہ "آگے جاؤ" شبراتی میاں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور پھرتے پھراتے گاؤں کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔

گاؤں کے آخری سرے پر اُنھیں ایک کچا پکا مکان دکھائی دیا جس کے سامنے ایک بہت بڑا چبوترہ تھا اور وہاں کئی چارپائیاں بچھی تھیں اور کئی لڑکے خوش گپیاں اُڑا رہے تھے۔ وہاں شبراتی میاں کو کچھ زندگی نظر آئی۔ لڑکوں سے باتیں کرنا یا اُن سے کچھ پوچھنا شبراتی میاں کو پسند نہ تھا۔ مگر مجبوری تھی، رات ہو گئی تھی، گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آ چکے تھے اس کے آگے اور کوئی مکان بھی نہ تھا، چبوترہ پر کوئی بڑھا بھی نہ تھا جس کو شبراتی میاں مخاطب کرتے۔ چنانچہ شبراتی میاں نے مجبوراً نوجوانوں کے قریب پہنچ کر دریافت کیا "کا ہو یہی نجّن میاں کا دوار ہی نا؟ سب جگہ وہ دریافت کر آئے تھے، سب نے یہی کہا تھا کہ آگے جاؤ" اور اب یہ گاؤں کا آخری مکان تھا نجّن میاں کا یقیناً یہی مکان ہو گا۔ لیکن اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُن کے کانوں میں پھر یہی صدا گونجی کہ "آگے جاؤ"

شبراتی میاں کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا سب گاؤں والوں نے کیا ان کو بھکاری سمجھ لیا ہے۔ "آگے جاؤ" "آگے جاؤ" کیا اس "آگے جاؤ" کی کوئی حد بھی ہو گی۔ ان کو اس گاؤں

اور وہاں کے رہنے والوں سے نفرت ہو گئی انسانوں سے الگ ہو کر اب ان کو خدا اور خدا کا گھر یاد آیا واہ! واہ! یہ انھوں نے پہلے کیوں نہ سوچا تھا خواہ مخواہ ڈر ڈر کیوں مارے مارے پھرے بس اب مسجد چلو وہیں اطمینان سے رات بسر ہو جائے گی خدا کے گھر میں تو "آگے جاؤ" کا سوال نہ پیدا ہو گا وہاں سے تو کوئی انھیں نہ دھتکارے گا چنانچہ شبراتی میاں یہی سوچتے ہوئے مسجد میں پہنچ گئے مغرب کی نماز ہو چکی تھی نمازی رخصت ہو چکے تھے۔ مؤذن صاحب بھی جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ شبراتی میاں نے اندر پہنچکر زور سے "السلام علیکم" کا نعرہ مارا اور ایک طرف جوتا اُتار کر صحن مسجد میں بیٹھ گئے۔ موذن نے شبراتی میاں کو بھکاری سمجھ کر کہا "بابا! یہ مسجد ہے یہاں بھیک نہیں ملتی کسی کے دروازہ پہ جا کر صدا لگاؤ"

شبراتی میاں نے موذن کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا۔

"تم کیا کہتے ہو ہم بھکاری نہیں ہیں ہم اپنے گاؤں کے جمیندار (زمیندار) ہیں یہ دیکھو ہم اپنی گٹھری میں چپڑی بیسن کی روٹی اور پیاز رکھے ہن (ہیں)، اچھا ذرا ایک لوٹے میں پانی لا دو میں اس گاؤں میں پہلے رہ چکا ہوں جانتا ہوں کہ اس کنوئیں کا

پانی کھاری ہی"۔

مؤذن نے کہا "خوب گویا محرم کا مہینہ ہی جو ہم تم کو پانی یا شربت پلائیں گے ارے میاں یہی غنیمت سمجھو کہ اس مسجد کے متولی قبلہ حاجی صاحب یہاں تشریف نہیں رکھتے ورنہ وہ تم کو یہاں اس طرح بیٹھ کر باتیں نہ بنانے دیتے اُن کا سخت حکم ہی کہ کوئی مسافر مسجد میں رات کو ٹھہرنے نہ پائے"۔ شبراتی میاں یہ سُن کر بیٹھے بیٹھے کھڑے ہو گئے اور بولے "کیا حاجی صاحب کا اللہ میاں کے گھر پر بھی قبضہ ہی؟ غضب خدا کا عجیب گانو ہی اور اس گانو کے رہنے والوں کو کیا کہوں نہ اپنے گھر میں جگہ دیت (دیتے) ہیں اور نہ اللہ میاں کے گھر میں رہے دیت (رہنے دیتے) ہیں"۔

اتنا کہہ کر بغیر کھائے پئیے شبراتی میاں نے اپنا ڈنڈا اُٹھایا اور گانو سے باہر ہو گئے۔ اب شبراتی میاں کو پچیس سال پہلے کا سید پور اور سید پور کے رہنے والے یاد آ گئے وہ زمانہ بھی کیا خوب تھا جب گانو میں نہ اتنے پکے مکانات تھے نہ خوش نما حویلیاں لیکن جب دن وہ گانو سے رخصت ہوتے تھے تو گانو والے انھیں دور تک پہنچانے آتے تھے

لیکن آج اسی گاؤں میں ان کے جلو میں بھونکنے والے کتوں کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ رات کی تاریکی میں گاؤں کی پیچیدہ۔ گندی اور تنگ ناہموار گلیوں کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے جب شبراتی میاں گاؤں سے کچھ دور نکل گئے تو یک بارگی ان کے کانوں میں آواز آئی۔ "بابا! اتنی رات ہاں کہاں جاتے ہو یہاں آجاؤ رات کو یہیں آرام کرو صبح چلے جانا۔" گاؤں سے تھوڑی دور پر کچھ ٹوٹے پھوٹے کچے مکانات تھے وہیں سے کسی نے شبراتی میاں کو پکارا تھا گو شبراتی میاں کو رنج وغم۔ غصہ اور تاریکی کی وجہ سے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا پھر بھی اس آواز میں انھیں خلوص ومحبت کی بو آئی اور وہ اسی آواز کی طرف پلٹ پڑے ایک بڑھے مسلمان نے جو بظاہر مزدور یا کاشتکار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھ کر شبراتی میاں کو سلام کیا اور اپنے دروازہ پر لے جاکر بڑی خاطر سے چارپائی پر بٹھایا منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی رکھا اور بغیر کچھ کہے سنے دو موٹی روٹیاں کچھ ساگ اور ارہر کی دال لاکر سامنے رکھدی شبراتی میاں کا دل دکھا ہوا تھا ایک اجنبی کاشتکار یا مزدور کی بے غرض نسبت اور خاطر ومدارات کو دیکھ کر دہ دنگ رہ گئے شکریہ ادا

کرنے کے لئے اُن کی زبان سے کچھ نہ نکل سکا اس وقت پھر انھیں وہی چالیس سال پہلے گانو والوں کی بے غرضانہ سلوک و محبت بھری باتوں کی یاد آ گئی جب یہ پورا گانو اسی محبت و خلوص کا مرکز تھا کھانا کھانے کے بعد جب شبراتی میاں کے سامنے ٹھیا حقہ (ایسا دیہاتی حقہ جس کی فرشی مٹی کی بنی ہوتی ہے) بھر کر سامنے رکھا گیا اور انھوں نے دو چار کش لیے تو کہنے لگے "کیوں بھیا! تم کا ننھن میاں کا کچھ حال معلوم ہے اب وہ کہاں رہت ہیں؟"

بوڑھے کاشتکار نے کہا "بابا! ان کو تو اللہ میاں کے یہاں گئے کئی سال ہو گئے ان کی پکی حویلی وہی تو ہے جو اسٹیشن کے پاس ہے۔

ننھن میاں کی وفات کی خبر سن کر شبراتی میاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُن کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اور اُن کے دونوں ہاتھ خود بخود دعائے مغفرت کے لئے اٹھ گئے۔

چھٹکارا

مکھوشاہ خاندانی فقیر تھے۔ روزانہ شام کو آس پاس کے دوچار گانو میں چلے جاتے اور قریبًا ہر گھر سے ایک ٹکڑا روٹی کا پا جاتے۔ ہر فصل پر دوچار من اناج بھی مل جاتا۔ خاندانی تکیہ دار بھی تھے کوئی مرے یا جیئے۔ شادی ہو یا غمی مکھوشاہ کی ہر طرح سے چاندی تھی۔ بیوی مر چکی تھی۔ ان کے اکلوتے بیٹے بدلو کے سوا اب اس دنیا میں ان کا کوئی عزیز نہ رہ گیا تھا "شاہ" ان کے خاندان کا خود ساختہ خطاب تھا اسی لحاظ سے بدلو شاہ کہلاتے تھے۔ مکھوشاہ نے بہت چاہا کہ وہ کم از کم اردو مڈل تو پاس کر لے۔ لیکن جس نے بچپن ہی سے

بھیک مانگنے کی تعلیم حاصل کی ہو۔ فقیروں میں تربیت پائی ہو۔ اُسے پڑھنے لکھنے میں کیا خاک مزا ملتا۔ گانو کے مُلّاجی سے "بغدادی قاعدہ" بھی ختم نہ کیا تھا کہ بدّو شاہ مکتب سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مکھّو شاہ ایک مرتبہ اپنے گانو "نوگانہ" سے کسی کام کے لئے پانی پت گئے ہوئے تھے۔ وہاں اتفاق سے اُن کی ملاقات کسی خانہ بدوش "بیرجی" سے ہوگئی۔ اور یہ اُس کے اتنے معتقد ہوئے کہ چھ مہینے تک اُسی بیرجی کے ساتھ گانو گانو شہر شہر پھرتے رہے۔ اس سیاحی میں مکھّو شاہ کو پتہ چلا کہ اس زمانہ میں بیری بھی ایک پیشہ کی حیثیت رکھتی ہی۔

مکھّو شاہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب کوئی ضرورت مند خانہ بدوش "بیرجی" کی خدمت میں اپنی مرادیں مانگنے کے لئے حاضر ہوتا تو بیرجی اُسی کی گرہ سے شراب کی ایک بوتل منگا کر کچھ خود پی جاتے اور باقی جھوٹا بطور تبرک ضرورت مند کو پلا دیا جاتا۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مکھّو شاہ پر خانہ بدوش "بیرجی" کی صحبت کا اثر نہ ہوتا۔ جس رنگ میں بیر تھا اُسی رنگ میں اس نے اپنے معتقد کو رنگ دیا۔

مکھو شاہ پڑھے لکھے نہ تھے پیر جی نے اُنھیں کچھ جھاڑنا پھونکنا سکھا دیا۔ ایک جنگلی بوٹی کی یہ خاصیت بتا دی کہ جب اس کو مُنہ میں رکھ کر گلاس میں پانی پیا جائے گا۔ تو تمام پانی میٹھا ہو جائے گا۔ مکھو شاہ کے کمانے کے لئے اتنی ہی تعلیم بہت کافی تھی۔ وہ جب اپنے گانو میں واپس ہوئے تو اچھے خاصے 'پیر جی' بنے ہوئے تھے۔ لمبا گیروا کرتا بدن پر، قلندری ٹوپی سر پر، تسبیح ہاتھ میں اور سر کے لمبے بال کندھے پر ڈالے ہوئے جب مکھو شاہ "لوگانہ" پہنچے تو اوروں کا کیا ذکر خود بدلو شاہ بہ یک نظر اپنے باپ کو نہ پہچان سکا۔ مکھو شاہ نے گانو بھر میں مشہور کر دیا کہ اُنھیں خواجہ غریب نواز کے دربار سے فیض حاصل ہوا ہے۔ ایک دن مکھو شاہ دوپہر کے وقت گانو کے مُکھیا کے یہاں پہونچے۔ اور جاتے ہی ایک گلاس پانی مانگا مُکھیا گھر پر موجود نہ تھا۔ کسی ملازم نے پانی لا کر دیا۔ تھوڑا پانی پی کر مکھو شاہ نے نوکر سے کہا "لے یہ پانی پی لے۔ مولا تیری سب مرادیں پوری کرے گا۔" یہ کہہ کر مکھو شاہ تو رخصت ہو گئے لیکن جب نوکر نے اِن کا جھوٹا پانی پیا تو اسے میٹھا پایا۔ مکھو شاہ کی یہ کرامت تمام گانو میں مشہور ہو گئی۔ ضرورت مند دعا تعویذ

کے لئے مکھو شاہ کے پاس دوڑنے لگے۔ اب مکھو شاہ نے بھیک مانگنا بند کر دیا تھا۔ نذر و نیاز ہی پر اُن کی بسر اوقات ہوتی تھی۔

(۲)

گانو میں آمدنی کا کافی ذریعہ نہ دیکھ کر مکھو شاہ بھی خانہ بدوش پیر جی بن گئے۔ صاحب زادہ میاں بدلو شاہ بطور خلیفہ اِن کے ہمراہ رہتے۔ اور عوام میں اپنے والد بزرگوار کی کرامتوں کا پُر زور پروپیگنڈا کرتے۔

غریب دیہاتی جنھیں زمینداروں اور مہاجنوں نے تباہ کر رکھا ہی۔ جن کا دنیا میں کوئی پرسانِ حال نہیں وہ جب کسی جٹا دھاری سادھو۔ کسی مقطع صورت پیر جی کو دیکھتے ہیں تو اسے آنکھیں بند کر کے بلا سوچے سمجھے اپنا حاجت روا سمجھ لیتے ہیں ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہی کافی ہوتا ہی سرمایہ داروں کے ستائے ہوؤں کو۔ شوہر کی سختیاں اُٹھانے والیوں کو پیر جی پر خضر کا احتمال ہوتا ہی۔

پنجاب و سندھ کی سرحد پر سکھ، ہندو جاٹ اور پنجابی مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گانو "لال گنج" کے نام سے مشہور ہی۔

لکھو شاہ نے اس بستی کو اپنے مطلب کے لئے خاص طور پر موزوں پایا۔ اور وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا۔ خلیفہ جی نے بھی اِدھر اُدھر پھر کر پیر جی کی وہ وہ کرامتیں بیان کیں کہ لال گنج کا کیا ذکر آس پاس کے لوگ بھی "پیر جی" کو فرشتہ رحمت سمجھنے لگے۔ سب نے پیر جی کو اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی۔ تقریباً تمام مسلمان مع متعلقین اُن کے مرید ہو گئے۔ پیر جی کے حکم سے اُن کے مریدوں نے ان کے لئے گاؤں سے باہر ایک خانقاہ بنوا دی۔ جس میں پیر جی اپنے خلیفہ بدلو شاہ کے ساتھ رہنے لگے۔ خانقاہ میں مردوں سے زیادہ عورتیں اپنی مرادیں طلب کرنے کے لئے پہونچتیں۔ وہ پیر جی کے سامنے اپنی ساس نندوں کی بدسلوکی، اپنے شوہر کی بے اعتنائی اور مال و اولاد کے ارمانوں کا قصہ چھیڑتیں۔ لکھو شاہ آنکھیں بند کئے چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ ان کی طرف سے بدلو شاہ کچھ خاک دھول اُٹھا کر دیدیتا۔ عورتیں اسی کو تبرّک سمجھ کر خوش خوش گھر لے جاتیں۔

۳

لکھو شاہ کی قسمت میں زیادہ عرصہ تک عیش کرنا لکھا نہ تھا لال گنج میں آئے انھیں چوتھا مہینہ تھا کہ معمولی بخار آیا اور ان کی

موت کا بہانہ ہو گیا۔ بڑی دھوم دھام سے ان کی تجہیز و تکفین کی گئی۔ اور خانقاہ ہی کے پاس ان کا مزار بنا یا گیا۔ بکھو شاہ کے مرتے ہی بدلو شاہ سجادہ نشین ہو گئے۔ چڑھتی جوانی میں بدلو شاہ کی قسمت جاگ اٹھی۔ اب ہر جمعرات کو مزار پر قوالی ہونے لگی۔ گاؤں میں قوال کہاں۔ بدلو شاہ ہی نے دو چار لونڈوں کو اِدھر اُدھر کی چند بازاری غزلیں اور ٹھمریاں یاد کرا دیں۔ ڈھولک بجانے والے گاؤں ہی میں مل گئے۔ باقاعدہ محفل سماع منعقد ہونے لگی۔ شروع میں تو رنگ پھیکا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ کافی مجمع ہونے لگا۔ قبر پر چادریں چڑھنے لگیں۔ مرادیں مانگی جانے لگیں یہ ناممکن ہے کہ شہد پر مکھیاں نہ جمع ہوں۔ آس پاس کے گاؤں والوں نے جب مزار شریف کے انوار و برکات کا شہرہ سنا۔ تو زیارت کے لئے دوڑ پڑے نذر و نیاز میں زیادہ آمدنی ہونے لگی۔ تو بدلو شاہ نے بھی زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ بھنگ۔ گانجہ اور چرس کے دم لگنے لگے۔ شراب کی عادت نے بدلو شاہ کو بدمست بنا دیا۔ لیکن مریدوں نے اس کو "من کی موج" کہہ کر ٹال دیا۔

شروع میں مردوں ہی کا گانا ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ

پیر جی کی زیارت کرنے کے بہانے سے طوائفیں بھی آکر گانے لگیں اب جمعرات کی کوئی تخصیص نہ رہ گئی۔ بلکہ روزانہ رات کو حال و قال کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔

۴

گھنگھور گھٹائیں چھائیں تھیں۔ رم جھم پانی برس رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت رہا ہوگا بدلو شاہ اپنی خلوت میں چرس کا دم لگا رہے تھے کہ ایک عورت چادر سے منہ چھپائے ہوئے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو گئی۔ نو وارد عورت کو بھی اپنی کوئی مریدنی سمجھ کر بولے "اتنی رات کو تو ہمارے پاس کیوں آئی ہے۔ کیا تو نہیں جانتی کہ ہم اس وقت عبادت کرتے ہیں؟" عورت نے چہرہ سے چادر اٹھا دی۔ اٹھارہ انیس سال کی ایک قبول صورت کو دیکھ کر بدلو شاہ جھومنے لگے۔ طرز کلام بدل گیا اور کہنے لگے "آ بیٹھ جا میں نے تجھے پہچانا نہیں"؟ عورت نے کہا "کیا تم جمنی کو بھول گئے وہی جمنی جو کبھی تمہاری آنکھوں کا تارا تھی"۔

بدلو شاہ پر گویا بجلی گری۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہے پھر تیوری چڑھا کر بولے "کیا بکتی ہے؟ کچھ پاگل تو نہیں بابا! یہ عبادت کا وقت ہے۔ اللہ والوں کو کیوں ستاتی ہے؟

بھاگ جا یہاں سے ۔"

"اوہ! بڑا اللہ والا بنا ہے ۔ اللہ والوں کو کیوں بدنام کرتا ہے ۔ تیری عبادت کیسی ہوتی ہے ۔ یہ میں خوب جانتی ہوں ۔ یہ سب جان کر بھی میں اب تک اس وجہ سے خاموش رہی کہ تو نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ اب میں زیادہ عرصہ تک خاموش نہیں رہ سکتی ۔"

بدلوشاہ نے بگڑ کر کہا "بدمعاش عورت! چپ رہ! میں نے تجھ سے کبھی کوئی وعدہ ہی نہیں کیا ۔"

زخم خوردہ ناگن کی طرح بل کھا کر جُمنی نے کہا ۔ "بدمعاش تو ہے جو پرائی بہو بیٹیوں کو بُری نظر سے دیکھتا ہے ۔ تو پیر نہیں بلکہ انسانی شکل میں شیطان ہے ۔ میں نے تو تجھے اپنا پیر و مرشد سمجھا تھا ۔ میں یہ کیا جانتی تھی کہ تو میری زندگی تباہ کر دے گا ۔ آہ تو نے مجھے کسی لائق نہ رکھا ۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیری بدمعاشی ہی کی وجہ سے میں اُمید سے ہوں ۔ میں اس راز کو بہت دنوں تک نہیں چھپا سکتی ۔ تو اب بھی اپنا وعدہ پورا کر دے ۔"

اتنا کہہ کر جمنی کا گلا بھر آیا ۔ اور وہ رونے لگی ۔ جس طرح بچے کھیل کود میں کچے پھل توڑ کر کام میں نہیں لاتے ۔ بلکہ یوں ہی

پھینکدیتے ہیں۔ اسی طرح ہنسی ہنسی میں بدلوشاہ جمنی کی طرح خدا جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو تباہ کر چکا تھا۔ جمنی کی فریاد نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اُلٹا اُسے جھڑک کر کہا۔

"اپنے پیر پر جھوٹا الزام لگاتی ہے۔ ہٹ جا سامنے سے نہیں تو مجھے جلال آجائے گا۔ میرا غصّہ نہیں جانتی۔ ایک پل میں خاک سیاہ کر دوں گا۔"

میں پیر ہو کر بھلا گناہ کر سکتا ہوں۔ توبہ۔ توبہ رے بس ہٹ جا سامنے سے۔ نکل جا یہاں سے۔ بدمعاش کہیں کی۔"

عورت جس سرگرمی سے محبت کر سکتی ہے اُسی طرح وہ اظہار نفرت میں بھی تیز ہو جاتی ہے۔ عورتیں مجسم انتقام ہوتی ہیں۔ بدلوشاہ کے سلوک و الفاظ نے جمنی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ شہد کی مکھی جب غصّہ میں آتی ہے تو اُس کے سامنے جو آتا ہے کاٹ کھاتی ہے۔ اس کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ وہ دانت پیس کر بولی "ڈر او بدمعاش خدا کے خوف سے ڈر۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ تیرے انکار کرنے سے میں خاموش ہو جاؤں گی۔ نہیں ہرگز نہیں تو مجھے تباہ کر کے چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ میں برادری سے نکال دی جاؤں گی۔ کوئی پرواہ نہیں۔ مگر تیری بدمعاشیوں کا

ڈھنڈورہ تمام دنیا میں پیٹتی پھروں گی۔ جس طرح تو نے مجھے تباہ کیا ہے۔ خدا بھی تجھے تباہ کرے گا۔ تف ہے تیری زندگی پر لعنت ہے تیری پیری پر! آخ تھو!" یہ کہہ کر جمنی نے نہایت حقارت سے بدلو شاہ کے منہ پر تھوک دیا۔ اور باہر نکلنے کو تیار ہوئی۔ بدلو شاہ اس ہتک کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے جوشِ غضب میں اٹھ جمنی کے پہلو میں اس زور سے لات ماری کہ جمنی بیہوش ہو کر گر پڑی۔ بدلو شاہ پر خون سوار تھا۔ اس نے جمنی کا گلا گھونٹ کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قیدِ ہستی سے آزاد کر دیا۔

(۵)

جمنی کی لاش کو ایک بوری میں باندھ کر بدلو شاہ نے پیٹھ پر لادا اور دبے پاؤں اپنی خلوت سے باہر نکلا۔ پانی اب بھی خوب زوروں کا پڑ رہا تھا۔ چاروں طرف خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے ساری کائنات کانپ رہی تھی۔ بدلو شاہ نے سوچا کہ خانقاہ سے تھوڑی دور جا کر کسی نالے میں جمنی کی لاش پھینک دے گا لیکن ابھی وہ چند قدم ہی گیا ہو گا کہ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص پیچھا کر رہا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن تاریکی میں

اسے کچھ دکھائی نہ دیا وہ آگے بڑھا۔ کسی کے پانو کی چاپ اسے سنائی دی۔ اب اُس نے بھاگنا شروع کیا۔

بدلو شاہ بھاگا جا رہا تھا۔ لیکن گناہ کی گٹھری اُس کی پیٹھ پر تھی۔ اس وقت اسے اپنا وہ زمانہ بھی یاد آ رہا تھا جب وہ اپنے وطن میں بھیک مانگنے گھر گھر جایا کرتا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا گھانس کا جھونپڑا۔ وہ گانو میں کبڈی کھیلنا۔ آہ کیسی بے فکری کا زمانہ تھا۔ کاش وہ پھر اپنے گانو میں پہنچ جائے۔ بدلو شاہ بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ کہاں؟ اور کیوں؟ اس وقت اس کا بھی اُسے کچھ ہوش نہ تھا۔ یکایک اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے جمنی کی لاش میں حرکت پیدا ہو گئی۔ جمنی کے دونوں ہاتھ بدلو شاہ کا گلا دبانے کے لئے بڑھے۔ بدلو شاہ مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے بھی اپنے مضبوط ہاتھوں کو پھیلا دیا۔ اور جمنی کا گلا پوری طاقت سے گھونٹ دیا۔ ایک کرخت آواز ایک درد انگیز چیخ سے ساری فضا گونج اٹھی۔ اور پھر سناٹا چھا گیا۔

صبح کے وقت خانقاہ سے صرف چند قدموں پر لوگوں کو دو لاشیں ملیں۔ ایک بوری میں جمنی کی لاش تھی

اور اُس کے نیچے بدلو شاہ کا بے جان جسم اُس کے دونوں ہاتھ اُس کے گلے پر تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسی نے خودکشی کی ہے۔

پردیسی

بوڑھے مہیش اونچے کُل کے برہمن تھے ان کو اپنے خاندان پر ناز تھا۔ گھر میں بوڑھی عورت اور اکلوتی لڑکی رادھا کے سوا اور کوئی نہ تھا جوانی میں یہ کسی پلٹن میں ملازم تھے اب چار روپیہ ماہوار پنشن پاتے تھے۔ ان کے گاؤں کنس پور میں ان کی کوئی جائداد نہ تھی جب تک ان کے بازوؤں میں طاقت رہی کاشتکاری سے اپنا کام چلاتے رہے لیکن اب ضعیفی کا عالم تھا، اِن سے کاشتکاری کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ چار پانچ بیگھے کھیت لے کر وہ دوسروں کو دے دیتے اور پیداوار میں آدھا حصہ لے لیتے وہ اسی میں خوش تھے رادھا کے بیاہ سے پہلے وہ سوچا کرتے

"جب رادھا کا بیاہ ہو جائے گا تو ہم دو پران رہ جائیں گے آدھ سیر آٹے میں ہمارا کام بن جائے گا ایک دن مرجائیں گے چھٹی ہو جائے گی" لیکن ان کا منشا پورا نہ ہوا رادھا کی سگائی انھوں نے روپ نگر کے ایک عالی خاندان برہمن زمیندار پرتاب نرائن کے لڑکے سورج پرشاد سے کی تھی روپ نگر سے برات بڑی دھوم دھام سے آئی رسوم ادا ہوئیں بھونریاں پڑ چکیں لیکن بدقسمتی سے بوڑھے مہیش کی ساری جمع پونجی ختم ہو چکی تھی۔ برات کی خاطر مدارات میں تو انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن جو کچھ طے ہوا تھا وہ نہ دے سکے دو چار روپیہ کی بات نہ تھی سیکڑوں کا معاملہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ رام پرتاب برات واپس لے گئے اور جاتے وقت کہہ گئے کہ وہ اپنے لڑکے کا دوسرا بیاہ کر دیں گے ہمارے بھروسہ اپنی لڑکی کو نہ بٹھا رکھنا۔

(۲)

بیاہ کو پورے پانچ سال ہو گئے کبھی یہ سننے میں آتا کہ سورج پرشاد کا بیاہ ہو گیا اور کبھی یہ سن پڑا کہ ابھی ہوا نہیں لیکن ہونے والا ہے۔ بوڑھے مہیش کا برا حال تھا وہ رادھا کے لئے پریشان تھے ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ اب انھیں کیا

کرنا چاہیئے۔ ایک دن رادھا سو گئی تھی۔ آدھی رات ہو گئی تھی نہیش کی آنکھوں میں نیند نہ تھی یہی حال اُن کی بیوی کا تھا۔ نہیش کی زبان سے بہت آہستہ سے نکلا "بھگوان اب کیا ہوگا؟" نہاراجن نے کہا ـــ "رات دن چنتا میں آپ کیوں پڑے رہتے ہیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا جو کچھ بھگوان نے ہمارے بھاگ میں لکھ دیا ہے وہی ہوگا"

"ہوتا جاتا کچھ نہیں۔ گھُل گھُل کر اپنی جان دینا ہمارے بھاگ میں لکھا ہے۔ جس سے پوچھو وہ یہی کہتا ہے کہ جو بھاگ میں لکھا تھا وہی ہوا یہ کوئی نہیں بتاتا کہ میرے مرنے پر میری رادھا کا کیا ہوگا؟"

بوڑھی نہاراجن چپ چاپ سنتی رہیں اُن کی زبان سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ نہیش چادر سے منہ چھپا کر رو اُٹھے کچھ دیر کے بعد سسکتے ہوئے بولے۔ "بھگوان! اس سے تو یہی بہتر تھا کہ کوئی اولاد ہی نہ دی ہوتی ہمارے بعد میری پیاری دُلاری کس کی ہوگی"

نہاراجن نے آہ بھر کر کہا۔ "گانو والے تو کہتے ہیں کہ رادھا کا دوسرا بیاہ ہو سکتا ہے"

"دوسرے لڑکے کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے ہم اونچے کُل کے برہمن ٹھہرے ایسا تو نیچ جاتیوں میں ہوتا ہے"!

(۳)

رادھا اب لڑکپن سے گذر کر عالم شباب میں تھی جب پاس پڑوس کی عورتیں اس کے گھر میں آتیں اور اُس کی ماں سے رادھا کے متعلق باتیں کرتیں تو وہ دل تھام کر رہ جاتی اور تنہائی میں جاکر اپنی قسمت پر آنسو بہایا کرتی۔

ایک دن جب مہیش اپنی بیوی سے رادھا کے متعلق باتیں کر رہے تھے رادھا بھی اتفاق سے وہاں پہنچ گئی ماتا پتا کو رنجیدہ دیکھ کر وہ اُداس ہوکر ماں کے پاس چپ چاپ بیٹھ گئی مہیش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رادھا نے سوچا۔"میری ہی وجہ سے میرے ماتا پتا کو اتنا رنج اٹھانا پڑتا ہے میں کیوں نہ آج ان کو سمجھا کر کہہ دوں کہ میری کوئی فکر نہ کریں" اُس کی زبان سے خود بخود نکل گیا۔"پتاجی آپ فضول رویا کرتے ہیں میں زندگی بھر آپ کی سیوا کروں گی اسی میں خوش رہوں گی ماتا پتا کی سیوا سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی خوشی نہیں ہو سکتی"!

رادھا کی بات سن کر مہیش نہ سنبھل سکے دل کا پھپھولا پھوٹ

گیا آنسوؤں کا سیلاب اس کے روکے سے نہ رکا آنسو بہانے سے جب ان کا جی کچھ ہلکا ہوا تو انھوں نے کہا۔ "رادھا! ابھی تیرا لڑکپن نہیں گیا ہم کیا تیری زندگی بھر تیرا ساتھ دے سکیں گے"

۔۔۔ اتنے میں رادھا کی کئی سہیلوں نے آکر کہا ۔۔۔ "رادھا! آج ہمارے گاؤں میں ایک سبھا ہے کیا دیکھنے نہ چلے گی؟"

مہیش نے کہا ۔۔۔ "جائے گی کیوں نہیں۔ جا بیٹی دیکھ آ۔"

رادھا سہیلیوں کے ساتھ سبھا میں پہنچ گئی۔ یہ کسان سبھا تھی اس میں ایک نوجوان کھدر پوش نے لکچر دیا۔ اس کا نام تو کوئی جانتا نہ تھا سب اسے "دیش سیوک" کہتے تھے۔ دیش سیوک نے ملک کی موجودہ حالت عورتوں۔ بیواؤں اور کسانوں کی مصیبتوں کا کچھ ایسے دردانگیز پیرایہ میں ذکر کیا کہ سننے والے رو پڑے۔ جب سبھا ختم ہوئی اور رادھا اپنے گھر واپس ہوئی تو اس نے سوچا ۔۔۔ "اگر بابا جی دیش سیوک کو اپنا حال بتائیں تو یہ ضرور مدد کریں گے۔"

۔۔۔ گاؤں والوں نے "سیوک جی" کو کچھ دنوں کے لئے گاؤں سے جانے نہ دیا سیوک جی ٹھہر گئے اور کھدر کا پرچار کرنے لگے۔

(۴)

ایک دن صبح کے وقت سیوک جی گاؤں کے مکھیا رگھوناتھ داس کے ساتھ مہیش کے مکان کے پاس سے گذرے مہیش کی طبیعت خراب تھی وہ تکلیف کے مارے کراہ رہے تھے۔ سیوک جی رک گئے اور انھوں نے دریافت کیا۔ "یہ کون کراہ رہا ہے" رگھوناتھ۔ "مہیش پرشاد ایک بوڑھے برہمن ہیں وہی کراہ رہے ہیں"

"کیا ان کے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟"

"بس ایک لڑکی ہے ایک ہفتہ ہوا ان کی بوڑھی عورت بھی پرلوک سدھاری" یہ کہہ کر رگھوناتھ نے رادھا کی شادی کا بھی سارا حال سنا دیا۔ سیوک جی نے کہا۔۔

"کیا اس وقت ہم مہیش پرشاد کو دیکھ سکتے ہیں"

"ہاں چلئے" کہہ کر رگھوناتھ سیوک جی کے ساتھ مہیش کے گھر میں "رادھا" کو پکارتے ہوئے گھسے ان کے پاس پہنچ کر رگھوناتھ نے بڑی محبت سے پوچھا۔ "پنڈت جی! کیا حال ہے؟"

مہیش نے آہستہ آہستہ کروٹ بدل کر کراہتے ہوئے جواب

دیا۔ "کیا بتاؤں بٹیا! موت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ بدن میں بہت درد ہے سر پھٹا جاتا ہے —— آہ —— آہ —— بٹیا یہ تمہارے ساتھ کون ہیں۔ مجھے دکھائی کم دیتا ہے ——،

یہ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ مہاتما جی کے چیلے ہیں۔ دیش کی سیوا کے لئے نکلے ہیں ہم سب اِن کو سیوک جی کہتے ہیں۔

مہیش —— "گاندھی جی تو دیوتا ہیں ان کے بھگت دھن ہیں —— آہ! آہ!"

سیوک جی نے مہیش کی نبض دیکھ کر کہا —— میں آپ کے لئے ابھی دوا لاتا ہوں آپ کی سب تکلیف کم ہو جائے گی بخار بھی اتر جائے گا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں"

مہیش —— بڑا پُن ہو گا بٹیا! دہائی گاندھی جی کی —— آہ! آہ! ——"

تھوڑی دور پر رادھا کھڑی تھی دوا لینے چلے تو سیوک جی کی نظر رادھا پر پڑی انھوں نے سوچا "یہ جوان لڑکی بھی بیچارے بوڑھے کی چھاتی کا پتھر ہو رہی ہے بدقسمت! واہ رے بھگوان!"

رادھا نے مہیش کے پاس جاکر کہا ــــــ "پتا جی! یہ جو ابھی دوا لانے گئے ہیں انھیں نے اس دن سبھا میں ویکھیان دیا تھا بڑی اچھی اچھی باتیں کہتے تھے ــــــ"

یکایک سیوک جی نے گھر میں آکر کہا ــــــ "لیجئے پنڈت جی دوا کھا لیجئے۔ فوراً آپ کو آرام معلوم ہوگا"

رادھا لاج و شرم سے وہاں سے ہٹ کر الگ کھڑی ہو گئی۔ مہیش نے ایک بار آنکھیں کھول کر پھر بند کرتے ہوئے کہا

"بٹیا! بیٹھ جاؤ! میرے کارن تمھیں بڑی تکلیف ہوئی"

مہیش کی بات کا کچھ جواب نہ دے کر سیوک جی نے رادھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ــــ "تھوڑا سا پانی لائیے۔ میں ابھی دوا پلا دوں"

رادھا دوڑ کر ایک گلاس میں پانی لے آئی۔ سیوک جی نے دوا پلا کر کہا ــ "اب میں جاتا ہوں کل پھر آؤں گا"

مہیش نے آہستہ سے کہا ــ "اچھا بھگوان تمھیں بنائے رکھیں بٹیا!"

(۵)

مہیش کے جسم کا درد تو اسی دن غائب ہو گیا اور بخار بھی

تیسرے دن جاتا رہا۔ سیوک جی روزانہ ان کے گھر پر جاکر دوا پلایا کرتے طبیعت سنبھل جانے پر مہیش کے دل میں سیوک جی کی بڑی محبت ہو گئی۔ سیوک جی کی باتیں مہیش کو امرت کی طرح معلوم ہوتی تھیں وہ دنیا سے گھبرا چکے تھے لیکن سیوک جی کو پاکر ان کا غم غلط ہو گیا مگر کتنے دنوں کے لئے؟

ایک دن مہیش نے سیوک جی سے کہا ۔ "بیٹا ہم تمہارے بڑے احسان مند ہیں۔ ہمارے کون تھا جو ہماری اتنی خدمت اور دیکھ بھال کرتا ۔ مجکو تو یہ الیقین تھا کہ اب میں نہ بچوں گا تم نے آکر میری جان بچالی ۔ ہائے میں بڑا بد قسمت ہوں جب مجھے اپنی معصوم بچی کا خیال آتا ہے اور سوچتا ہوں کہ میرے بعد اس کا کیا حال ہوگا تو کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے" یہ کہہ کر مہیش نے رادھا کی شادی کا مفصل حال سنادیا۔ مہیش کی باتیں سن کر سیوک جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

تھوڑی دور پر رادھا بیٹھی ہوئی یہ سب باتیں سُن رہی تھی سیوک جی نے بڑی حسرت بھری نظروں سے رادھا کی طرف دیکھا رادھا نے سر کا آنچل سرکا کر ایک گہری سانس لی۔

سیوک جی نے کہا ۔ " پنڈت رام پرتاب کے لڑکے

سورج پرشاد کو کبھی آپ نے رادھا کے بارے میں کوئی خط نہیں لکھا۔"

"نہیں بیٹا میں نے کبھی نہیں لکھا"

"آپ کو ضرور لکھنا چاہیئے تھا"

کچھ دیر کے بعد سیوک جی اُٹھ کر چلے گئے۔ رادھا گھر کے کام میں لگ گئی اس کی نظروں کے سامنے اب سیوک جی کی موہنی صورت ہر وقت رہنے لگی اسے سیوک جی کی پیاری باتیں یاد آتیں وہ سوچتی "سیوک جی" کتنے نیک اور کتنے رحم دل ہیں جی چاہتا ہے کہ ہر وقت ان کی باتیں سنا کروں۔

ایک دن سیوک جی گاؤں سے کہیں باہر چلے گئے۔ رادھا کا جی اداس ہو گیا کام میں اس کا دل نہ لگا۔ بار بار باہر جا کر وہ چاروں طرف دیکھتی اور پھر کسی کو نہ دیکھ کر واپس آ جاتی۔ کام کرتے کرتے وہ چونک اُٹھتی اُسے ایسا معلوم ہوتا گویا سیوک جی آ گئے ہیں۔

جب تین دن ہو گئے اور سیوک جی نہ آئے تو رادھا کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی جب تک اُس نے سیوک جی کو دیکھا نہ تھا اُسے کسی بات کی تکلیف نہ تھی اس قسم کی اسے کبھی بے چینی نہ ہوئی

تھی لیکن اب وہ سیوک جی کو غیر نہیں اپنا سمجھتی ہی۔ جب مہیش کہتے "معلوم ہوتا ہی کہ سیوک جی اب نہ آئیں گے افسوس وہ جاتے وقت کچھ بھی نہ کہہ گئے" تو رادھا کا دل بیتاب ہو جاتا وہ ایسا اُداس ہو جاتی گویا اس کی جان سے زیادہ پیاری چیز کھو گئی ہی۔

دو دن اور گذر گئے رادھا کی پریشانی اور بڑھ گئی اس نے یہ نہ سوچا کہ سیوک جی حقیقت میں اپنے نہیں پرائے ہیں وہ ایک دن رُلا کر چلے جائیں گے۔

ایک دن سہ پہر کے وقت گھر کے آنگن میں رادھا اُداس بیٹھی تھی کہ سیوک جی آ گئے۔ رادھا فوراً اُٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی دل میں مسرت کی لہریں اُٹھنے لگیں گویا سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ مہیش کو پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹے دیکھ کر سیوک جی نے رادھا سے پوچھا۔ کیا پنڈت جی سو رہے ہیں" رادھا کچھ جواب نہ دے سکی تھوڑی دیر کے بعد پھر سیوک جی نے اپنا سوال دھرایا۔ اب رادھا نے جس طرح سے بھی ہو سکا بڑی مشکل سے اپنے دھڑکتے ہوئے دِل کو سنبھالا اور سیوک جی کی طرف دیکھ کر ایک عجیب انداز میں بولی۔ "آپ کہاں

چلے گئے تھے"

"ایک دوسرے کا تو بس سبھا ہونے والی تھی وہیں گیا تھا"

"جاتے وقت کچھ کہہ بھی نہ گئے۔ اتنے دنوں میں نہ جانے......" یکبارگی رادھا کو اپنی کمزوری کا خیال آگیا آہ اوس کی زبان سے کیا نکلنے والا تھا اُس نے سنبھل کر کہا۔

"پتا جی برابر آپ کو یاد کیا کرتے تھے"

سیوک جی نے بے ساختہ کہا۔ "اور آپ؟"

رادھا نے مسکرا کر اپنا سر جھکا لیا شرم و لحاظ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

سیوک جی نے پوچھا۔ "کیا پنڈت جی ابھی نہ جاگیں گے؟"

رادھا کسی اور عالم میں تھی گویا اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں اس کے کانوں میں بار بار کوئی کہہ رہا تھا۔ "اور آپ!"

اچھا اب میں جاتا ہوں۔ کل اسی وقت پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر سیوک جی چلے گئے اور دوسرے دن آکر نہیش سے ملے۔ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے رادھا وہیں کچھ دور بیٹھی باتیں سُن رہی تھی اخیر میں سیوک جی نے نہیش سے کہا۔ "پنڈت جی آج میں چلا جاؤں گا۔ میری وجہ سے اگر آپ کو کچھ تکلیف

پہونچی ہو تو معاف کیجیے گا"

سیوک جی کی بات سن کر رادھا کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ مہیش نے کہا۔" بیٹا! تم نے ہم پر بڑا احسان کیا ہی اب میں تمھیں کہاں دیکھوں گا۔ تم کو پاکر میں اپنا دکھ بھول گیا تھا اب کون میری مدد کرے گا۔ تمھارے جانے کے بعد مجھے جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ابھی سے میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ تم تو اب جا ہی رہے ہو اچھا جاؤ پرماتما تمھیں سکھی رکھیں لیکن مجھے کوئی ایسی بات تو کہتے جاؤ جس سے دل کو کچھ ڈھارس ہو"

مہیش کی باتیں سن کر" سیوک جی" کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں انھوں نے کہا۔" آپ گھبرائیے نہیں میں خود روپ نگر جاکر سورج پرشاد کو اچھی طرح سمجھاؤں گا اور مجھے امید ہی کہ وہ میری بات مان لیں گے اور فوراً آپ کی سیوا میں آئیں گے۔ میرا خیال ہی کہ انھوں نے اب تک کوئی دوسرا بیاہ نہیں کیا وہ میری ہی طرح مہاتما گاندھی کے بھگت ہیں اور دیش کی سیوا میں لگے ہوئے ہیں"

چلتے وقت سیوک جی نے رادھا کی طرف دیکھ کر کہا۔" آج میں جا رہا ہوں اگر میری وجہ سے کوئی تکلیف پہونچی ہو تو معاف کیجیے گا"

رادھا کے گالوں پر آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک پڑیں آواز بند ہو گئی اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ سیوک جی خصت ہو گئے نہیش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے رادھا بھی پتا کی چارپائی سے لگ کر آنسو بہانے لگے۔

(۶)

سیوک جی کو پاکر نہیش کو جو اطمینان قلب حاصل ہوا تھا وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا وہ پھر رنج و غم کی زندگی بسر کرنے لگے رادھا کی دنیا تاریک ہو گئی وہ دن میں کئی بار چونک اوٹھتی رات کی نیند حرام ہو گئی جس سے خواب میں بھی سیوک جی سے ملنے کا سہارا نہ رہا۔ اس نے پہلے سمجھا تھا کہ دو چار دن میں وہ نہیش کو بھول جائے گی لیکن اس کے برخلاف اس کی بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ جب اس کو خیال آتا کہ اب سیوک جی کبھی واپس نہ آئیں گے تو وہ سوچنے لگتی۔ "وہ ایک پردیسی مسافر تھے کچھ دن یہاں رہ کر اپنی میٹھی باتوں سے سب کو اپنا بنالیا اور جب جی چاہا یہاں سے چلے گئے ان کا اور میرا کیا تعلق میں ان کے لئے کیوں بے کل ہو رہی ہوں مجھے تو بھگوان نے ابھاگن بنایا ہے۔ میں سہاگن ہونے کی کیوں اُمید رکھتی ہوں ؟" وہ اسی

قسم کی باتیں سوچ کر اپنے دل کو بہت سمجھاتی کہ اب وہ سیوک جی کو نہ یاد کرے گی لیکن اس کا دل پھر مچل جاتا اور سیوک جی کی یاد پھر ستانے لگتی اور وہ سوچتی ـــ "ہائے میں اس پاپی جیرا کو کیا کروں ۔ جو اُن کو بھولتا ہی نہیں آخر وہ میرے کون تھے جس کے تھے اس کے یہاں چلے گئے ۔ جو چیز اپنی نہیں ہے اس کے لئے بے کار ہائے ہائے کیسی ؟ ان کے ساتھ محبت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ۔ میں نے ان کے ساتھ کیوں محبت کی ۔ کیا میرے ساتھ جو کوئی اچھی طرح سے باتیں کرے گا مجھے قدر و عزت کی نظر سے دیکھے گا اُسے میں پیار کرنے لگوں گی ۔ کیا جو کوئی پتاجی کی مدد کرے گا مجھے اس کے ساتھ اتنی محبت ہو جائے گی کہ اس کو بغیر دیکھے مجھ سے رہا نہ جائے گا ۔ ایک غیر شخص کی میٹھی باتیں سننے کے لئے میں کیوں تڑپ رہی ہوں ۔ کسی خوبصورت آدمی سے جس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مجھ ابھاگن کی قسمت میں تو مرد لکھا ہی نہیں پھر یہ مفت کی بے چینی کیسی ؟" اسی طرح کی باتیں سوچ کر رادھا اپنے دل کو کوستی رہتی ۔

پھر بھی اس کا دل سیوک جی کی یاد سے غافل نہ ہوتا وہ بار بار اپنے دل سے پوچھتی ـــ "آخر وہ میرے پاس کیوں آئے تھے ۔ میں

بدقسمت تھی ۔ فلک کی ستائی ہُوئی تھی پریشان حال اور دُکھیا تھی لیکن اپنی قسمت پر شاکر تھی اُن سے اپنا دُکھڑا تو روئی نہیں گئی تھی ۔ میں انکو بلانے تو نہیں گئی تھی پھر وہ میرے یہاں کیوں آئے ان کو کس نے بلایا تھا ۔ اور جب آئے ایک دفعہ نہیں بار بار آئے تو پھر کیوں چلے گئے ؟" رادھا محبت کی آگ میں رات دن جلنے لگی ۔ کوئی اس کے دل کی لگی کو بجھانے والا نہ تھا ۔

ایک دن شام کے وقت رادھا اپنے باپ کے سر میں لگانے کے لئے کوئی دوا پیس رہی تھی اتنے میں پڑوس کی ایک عورت نے گھر میں آکر کہا ــــــ "روپ نگر سے سورج پرشاد آئے ہیں ۔ پالکی ۔ گھوڑا گاڑی اور کئی آدمی اون کے ساتھ ہیں "۔

رادھا گھبرا کر کھڑی ہو گئی ۔ مہیش بھی اپنی چارپائی سے اُٹھے لالٹین لے کر وہ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ ایک کھدر پوش جوان نے دوڑ کر مہیش کے چرن چھو لئے ۔ رادھا حیرت زدہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی مہیش نے لالٹین اوپر اُٹھا کر نو وارد کو بڑی حیرت اور غور سے دیکھا اور پھر جوش مسرت میں چلّا اُٹھے ــــ "بیٹا ! تم نے

میرے ساتھ یہ چھل کیوں کیا ؟"

جواب میں سورج پرشاد باسیوک جی رادھا کی طرف دیکھ کر مسکرا دئے اور رادھا سر کا آنچل سرکا کر لجاتی ہوئی کوٹھری میں گھس گئی ۔

نگار مارچ ۱۹۳۲ء

دِن کی روشنی میں

گیارہ بجے رات کا وقت رہا ہوگا۔ ایک دومنزلہ مکان کے نیچے ایک بوسیدہ اور تاریک کوٹھری میں کشوری زمین پر لیٹی تھی دیپک کا تیل ختم ہونے سے بجھ چکا تھا، ایک طرف تھالی میں کچھ بھوجن رکھا تھا۔ لیکن شوہر کا انتظار کرتی ہوئی کشوری نہ جانے کب نندیا دیوی کی گود میں سو چکی تھی۔

کمرہ کے باہر جوتوں کی آواز ہوئی اور کوٹھری کا دروازہ دھڑ سے کھل گیا اور اس کے ساتھ ہی غصّہ میں کسی نے پکارا۔۔۔۔

"حرام زادی! کیا سو گئی!"

کشوری چونک کر اُٹھ بیٹھی، آنے والا اُس کا شوہر بلدیو تھا۔

"بڑے آرام سے سو رہی ہے بولتی ہی نہیں"

کستوری نے گھبرا کر دیکھا کہ دیپک بجھ چکا ہے اور گھر میں دیا سلائی بھی نہیں، وہ اب کیا کرے۔

بلدیو نے چلا کر کہا "چپ چاپ اندھیرے میں کیوں کھڑی ہے" اتنا کہتے ہی بلدیو نے اپنے طاقتور ہاتھوں سے کمزور عورت کو ایسا دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل گر پڑی۔

"جلدی چراغ جلا میں کھانا کھاؤں گا"

کستوری نے آہستہ سے کہا "گھر میں دیا سلائی نہیں اور چراغ میں تیل بھی نہیں ہے۔ تیل خریدنے کو آپ پیسہ بھی نہیں دے گئے تھے"

بلدیو نشہ میں تھا شام ہی سے اس نے خوب پی لی تھی، اس کا غصہ بڑھ گیا اور پھر اس نے کستوری کو گھونسہ، لات اور ٹھوکر سے مارنا شروع کر دیا "حرام کی بچی کو میرا کچھ خیال ہی نہیں۔ پڑی پڑی مار کھائے گی مگر میری خدمت نہ کرے گی۔ بے حیا! بے شرم کیسی بد معاش عورت ہے"

بلدیو جب کستوری کو مارتے مارتے تھک گیا تو وہ اُسے گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا اور سڑک پہ پھینک کر واپس آ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ "جا! جہاں تیرا جی چاہے چلی جا! اب مجھے تیری

ضرورت نہیں۔ میرے گھر میں اب تیرے لئے جگہ نہیں، بدمعاش عورت! میرے گھر میں قدم رکھا تو جان سے مار ڈالوں گا۔"

جس طرح طوفانی ہواؤں سے شکست کھاکر پودا زمین پر جھک جاتا ہے، اسی طرح کستوری بھی سڑک پر گر پڑی۔ کب تک!..... آخر ہوش میں آکر کستوری نے دیکھا کہ سڑک پر بالکل سناٹا ہے، کچھ دور بڑی سڑک پر ایک موٹر سنسناتی ہوئی اِدھر اُدھر روشنی ڈالتی ہوئی نکل گئی اور پھر چاروں طرف تاریکی اور سناٹا! کستوری آہستہ آہستہ اُٹھ کر اپنی کوٹھری کے سامنے پہنچی اور دروازے پر دھکا مارنے لگی ایک بار، دو بار، تین بار! متواتر کئی بار، لیکن نہ تو دروازہ ہی کھلا اور نہ اندر سے کوئی جواب ہی ملا۔ کستوری نے سوچا۔ "روزانہ کا یہ ظلم و ستم اور بے عزتی اب تو ناقابل برداشت ہے آخر میں نے ایسا کون سا پاپ کیا ہے جس کی یہ سزا بھگت رہی ہوں۔ ماں کی گود کا آرام چھوڑ کر میں یہاں جب سے آئی ایک دن بھی آرام نہ ملا۔ شوہر! آہ! اُس نے کبھی بھولے سے بھی مجھ سے پیار و محبت کی باتیں نہ کیں، اس کے بجائے ہمیشہ مارتے پیٹتے رہے، اس پر بھی میں نے مشین کی طرح گرہستی کا کام سنبھالا، اور اب! اب مجھے ٹھوکر مار کر گھر سے نکال دیا ہے، اب میں کہاں جاؤں، اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں،

جب اپنا مرد ہی ٹھکرا دے تو عورت کے لئے مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اب جینے سے کیا حاصل مرنا ہی ٹھیک ہوگا۔ موت میں سُکھ ہے شانتی ہے اور اسی میں نجات ہے۔"

اس کے قدم خود بخود سڑک پر ایک طرف بڑھنے لگے مگر وہ ڈر رہی تھی، کانپ رہی تھی گویا ہر قدم پر اُسے کوئی روک رہا ہے۔

(۲)

وہ چلی جا رہی تھی کہ یکبارگی کشوری کے سامنے ایک شرابی آگیا۔ شرابی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور وہ کوئی گانا گا رہا تھا! اب اُس کی حفاظت کیسے ہو، ڈر کے مارے کشوری کا بُرا حال ہوگیا اور وہ ایک بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگاکر کھڑی ہوگئی۔

شرابی نے پوچھا "تم کون ہو ..... اتنی رات کو اکیلی کہاں جا رہی ہو۔ ایسے وقت میں جوان عورت کا گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔"

شرم اور ڈر کے مارے کشوری کانپنے لگی، وہ یکبارگی شرابی کے قدموں میں جھک گئی۔ شرابی کا نشہ ہرن ہوگیا اُس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "ماں جی! تم ڈرو نہیں میں تمھاری مدد کروں گا، تمھارا گھر کہاں ہے۔ چلو میں وہاں تم کو پہنچا آؤں"

ماں! کہنے ہی سے کستوری کا سارا ڈر جاتا رہا وہ بولی "میں ایک دکھیا ہوں جس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے" وہ رونے لگی۔

شرابی نے کہا "وہ کون ایسا ظالم ہے مجھے اس کا نام تو بتاؤ جس نے ایسی رات میں تم کو گھر سے نکال دیا ہے، چلو ابھی میرے ساتھ چلو میں تمھارے شوہر کا مزاج درست کر دوں گا"

وہ کانپ اٹھی۔ اس سے کون لڑ سکتا ہے، وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اس کا شوہر بلند یو بہت طاقتور ہے، مار پیٹ سے اس کا سارا جسم درد کر رہا تھا۔

شرابی نے پھر کہا "اچھی بات ہے آج میں کچھ نہ کہوں گا کل دیکھا جائے گا۔ مگر ماں جی! سڑک پر ساری رات کیسے کاٹو گی۔ چلو میرے ساتھ میرے گھر چلو....."

کستوری پر جیسے کسی نے جادو کر دیا وہ شرابی کے ساتھ چلنے لگی۔ شرابی خاموش تھا، کستوری بھی چپ تھی تھوڑی دور چل کر شرابی نے رک کر کہا "ماں جی! میرے گھر میں میرے سوا اور کوئی نہیں رہتا.... مگر کوئی فکر کی بات نہیں.... میں نیچے کمرے میں سوؤں گا.... ماں بیٹا کیا ایک ساتھ گھر میں نہیں رہتے۔؟"

شرابی کا چھوٹا سا مکان چندرماں کی روشنی میں ایک خوبصورت تصویر کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ شرابی نے دروازے کا تالا کھول کر کہا "اندر آجاؤ ماں! کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔"

ڈر! جب سے کشوری کی شادی ہوئی اس کو رات دن ہر وقت ڈرتے ڈرتے ہی جیون کاٹنا پڑا تھا۔

کشوری کو ساتھ لئے شرابی دو منزلہ پر گیا اور ایک کمرہ کھول کر کہا۔ "وہ بستر لگا ہے اس پر سو جاؤ ڈرنا نہیں۔ میں نیچے سوؤں گا۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بیٹا کہہ کر پکار لینا میرا نام رام لال ہے۔"

کشوری کو یہ سب کچھ خواب معلوم ہو رہا تھا۔

شرابی نیچے گیا اور کہیں سے کچھ کھانے کو لے آیا، کشوری اب تک کمرے کے دالان میں کھڑی تھی۔ رام لال نے کہا۔ "کھڑی کیوں ہو ماں! بھوکی نہ رہو کچھ کھا لو، اور کتنا سوچو گی۔ صبح ہوتے ہی میں تم کو تمھارے شوہر کے پاس لے چلوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

کشوری کے ساتھ اس سے پہلے کبھی کسی نے محبت اور ہمدردی سے باتیں نہ کی تھیں، وہ کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گئی۔ مار پیٹ سے اس کا سارا جسم درد کر رہا تھا، وہ تھوڑی دیر تک گزرے ہوئے

واقعات پر غور کرتی رہی اور پھر سو گئی ۔

۳

کشوری کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ صبح ہو گئی ہے، وہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی ۔ چاند اپنی مدھم روشنی سے بے حس اور ہیبت ناک مورتی کی طرح خاموش نظر آرہا تھا ۔ تاریکی پر روشنی کا قبضہ ہوتا جارہا تھا مگر اب تک طلوع آفتاب کی زریں شعاعوں نے اچھی طرح کائنات پر ستھراؤ نہیں کیا تھا ۔

اس کھڑکی سے کشوری نے کچھ دور اس دو منزلہ مکان کو دیکھا جس کے نیچے ایک تاریک کوٹھری میں اس نے اپنی زندگی کے سات سال گذار دیئے تھے، جہاں اس نے ایک دن بھی سکھ اور چین نہ پایا ۔ جہاں اس کی زندگی مار پیٹ اور بے عزتی میں گذری تھی جس طرح آسمان کی سطح کا اندازہ نہیں، جیسے سمندر کے پانی کی مقدار نہیں، اسی طرح اس وقت اس کے خیالات بھی بے انتہا تھے، وہ سوچنے لگی :۔ اب تو سب لوگ جاگ اٹھے ہوں گے اور میری تلاش ہو رہی ہو گی، سب پوچھ رہے ہوں گے کہ کشوری کہاں چلی گئی ۔ آہ! اسی وقت میں روزانہ اٹھ کر کمرہ میں جھاڑو دیتی تھی ۔ برتن

مانجتی تھی اور پھر اُن کے لیے ناشتہ بناتی تھی۔ آج جب وہ آٹھ بجے کارخانہ میں کام کرنے جائیں گے تو انھیں ناشتہ کون دے گا.... صبح ہوگئی اب مجھے گھر لوٹ جانا چاہیئے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے کے یہاں کیسے رہ سکتی ہوں"۔

کستوری دروازہ کھول کر دالان سے نیچے اتر گئی، اُس نے دیکھا کہ ایک کمرہ میں رام لال فرش پر سو رہا ہے۔ کستوری نے سوچا کیا اسے جگا کر وہ اپنے گھر چلی جائے مگر اس کی کیا ضرورت ہے، اب تک دن نہیں نکلا، دن نکلنے پر محلہ والے ہوشیار ہو جائیں گے، چاروں طرف شور مچ جائے گا۔ ایک اجنبی مرد کے ساتھ واپس جانے میں جب اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ رات بھر کہاں رہی تو.... کستوری کا سارا جسم کانپ اٹھا کل رات کو رام لال کے یہاں آکر اس نے سوچا تھا۔ وہ بچ گئی، رات بھر کے لئے ایک قابل اعتبار جگہ مل گئی، رات کو نہ کوئی ڈر تھا نہ خوف۔ لیکن کل رات کو وہ یہ نہ سوچ سکی تھی کہ جب رات کے جھلملاتے تارے چھپ جائیں گے، اور پو پھٹ جائے گی تو دن کی روشنی میں نئی باتیں پیدا ہو جائیں گی اُسے نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ایک اجنبی مرد کے مکان میں رات بھر سوئی تھی، اب دن کی روشنی میں جب یہ راز

کھلے گا تو دنیا کیا کہے گی۔ ناری کا جیون ہی کیا۔ کستوری نے کوئی پاپ نہیں کیا تھا کوئی خطا نہ کی تھی مگر ایک غیر محرم کے مکان میں وہ رات بھر سوتی رہی، یہ کوئی معمولی جرم نہ تھا جسے دھرم کے ٹھیکیدار معاف کر دیتے رات کو کسی نے دیکھا نہ تھا اس وجہ سے کسی نے کچھ نہ کہا مگر اب تو دِن نکل آیا تھا، چاروں طرف روشنی پھیل چکی تھی۔ اس روشنی میں رام لال کے ساتھ کستوری کیسے واپس جا سکتی تھی۔

کستوری نے سوچا "جس مرد نے میری حفاظت کی، میری عزت کی، وہ کتنا نیک اور شریف ہے، اس کا دل کتنا صاف اور پاک ہے اس کا شوہر ہی تو مرد ہے جس نے کل اسے خوب مارا اور رات کی تاریکی میں بے عزت ہونے کے لئے گھر سے دھکّے مار کر نکال دیا اور اب کیا اس کا ظالم شوہر یا پڑوسی، اس شریف رام لال کی جس نے رات بھر عزت و آرام سے اپنے گھر میں اس کی حفاظت کی کوئی قدر کریں گے ہرگز نہیں وہ جانے کیا سوچیں گے، وہ یقین ہی نہیں کر سکتے کہ رام لال نے مجھے ماں کی طرح اپنے گھر میں رکھا۔ اب کیا کیا جائے وہ کہاں جائے دنیا میں اب اس کا کہیں ٹھکانا نہیں"

کستوری اپنے شوہر کی سختیاں بھول گئی، کل رات کو اس نے جو باتیں سوچی تھیں وہ بھول گئی اس وقت تو وہ پچھتا رہی تھی۔ کہ وہ

رام لال کے گھر نہ آکر اپنے گھر کے دروازے ہی کے پاس رات بھر کیوں نہ پڑی رہی اس طرح سے کلنگ کا ٹیکہ لگنے کا ڈر تو نہ رہتا۔ ظالم شوہر کی سختیاں سہہ کر سنگدل کی مار کھا کر بھی عورت کو اُف نہ کرنا چاہیئے، یہی سماج کا قانون ہے اور دھرم کی مرضی، عالمِ خیال میں سینکڑوں مردوں کی نفرت بھری نظریں اس پر پڑنے لگیں، اُف رات کی تاریکی میں اور دن کی روشنی میں کتنا فرق ہے۔ رات کو منجمد تاریکی تھی بے حس و حرکت۔ لیکن سکون پرور، مگر دن کی روشنی میں تو سماج کے خیال سے وہ مُنہ دکھانے کے لائق نہ رہ گئی تھی۔

رام لال گہری نیند سو رہا تھا اور کشوری چنتا ساگر میں غوطے کھا رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے .... دن کی روشنی میں وہ گھر کیسے لوٹ جائے ـــ دُنیا جاگ اُٹھی تھی، چاروں طرف ہل چل تھی گویا ساری دنیا کشوری سے انتقام لینے کے لئے تیار تھی، ایسے میں وہ گھر لوٹنے کی کیسے جرأت کر سکتی تھی۔

رات کی تاریکی نے تو کشوری کے حق میں ماں کے آنچل کا کام کیا لیکن دن کی روشنی میں اُسے اپنی بے عزتی کا خیال گذرا اُسے کوئی پناہ دینے کے لئے تیار نظر نہ آیا۔

ساکھ

تاج پور گاؤں میں پورب جانب چمار ٹولہ ہی میں جھریوا، گنگوا اور جیتوا تینوں بھائی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ گنگوا اور جیتوا اپنے بڑے بھائی جھریوا کا خاص خیال رکھتے تھے۔ جھریوا تھا تو ذات کا چمار لیکن عجیب دل و دماغ لے کر پیدا ہوا تھا۔ نہایت ملنسار محنتی جفاکش اور بڑی آن بان والا چمار تھا۔ وہ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک رہتا اور گاؤں کے چھوٹے ہوں یا بڑے سب کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتا تھا اس وجہ سے صرف گاؤں والے ہی نہیں بلکہ گاؤں کے زمیندار اسمٰعیل میاں بھی جھریوا سے نہایت خوش رہتے تھے چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب جھریوا کا باپ مرا

اور تینوں بھائی یتیم ہو گئے تو اسمٰعیل میاں نے ان سب کی سرپرستی
کی اور جھرلوا کو شریک کاشت کر لیا۔ صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہی ہے
زمیندار کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے سے جھرلوا میں خودداری
کا جذبہ اور بھی ترقی کر گیا اسمٰعیل میاں ایسے زمیندار تھے جن میں
رعونت نام کو نہ تھی اسامیوں اور کاشتکاروں سے ان کا سلوک
نہایت شریفانہ تھا جھرلوا پر تو وہ خاص طور سے مہربان تھے
اور محبت میں جھرلوا کو "جھری" کہتے تھے۔ نام کے اس معمولی
تبدیلی سے چمار کی حیثیت خاص طور سے بڑھ گئی۔ "جسے پیا چاہے
وہی سہاگن" جس کو زمیندار عزت کی نظروں سے دیکھے اس کی
گاؤں والے کیوں نہ وقعت کریں چنانچہ سب لوگ آسے جھرلوا کے
بجائے "جھری" کہنے لگے۔ "جھرلوا" میں کمتری اور "جھری"
میں برتری کا رنگ جھلکتا تھا۔ ماگھ پوس میں جب کڑاکے کی سردی
ہوتی اور شام کو سورج ڈوبنے کے بعد بڑے بوڑھے غریب کاشتکار
سردی سے ٹھٹھرتے تو اسمٰعیل میاں کے دروازہ پر نیم کے نیچے ایک
بڑا الاؤ لگتا۔ اسمٰعیل میاں ایک کھری چارپائی پر بیٹھتے اور اُن
کے سامنے اِدھر اُدھر گاؤں والے بیٹھ کر الاؤ تاپتے۔ حیدر علی۔
اللہ دین عرف آلو چوکیدار۔ فتح اللہ جولاہہ۔ گیا دین بنیا بھگوان دین

ملاح - بنیاد علی - سعید میاں - سمبا پاسی - یوسف درزی اور جھری چمار وغیرہ بھی الاؤ تاپنے وہاں آجاتے اور پھر گذشتہ، حال اور مستقبل پر نہایت دلچسپ گفتگوئیں ہوتیں۔ "کپڑا مہنگا ہوتا جارہا ہے" "جگرو دھوبی رات کو اپنے گدھے کھول کر کھیت چرا لیتا ہے" اور باتوں پر تو گیا دین بنیا ہاں میں ہاں ملا دیتا لیکن جب مہنگائی کا ذکر ہوتا تو وہ سننے کی تاب نہ لاتا اور وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا۔ "اتو بھیا! یہ تو کلجگ ہے کلجگ! یاد ہے نہ وہ دن جب ایک روپیہ کا بیس سیر گیہوں ملتا تھا" اتو چوکیدار سر ہلا کر کہتا۔ "ہاں مہاجن! ٹھیک کہت ہو۔ مدا پھر تمہیں لوگن نے مہنگا کر دیو" سمبا پاسی چلم کا ایک دم لگا کر کہتا "واہ! اتو بابا واہ! کھوب ٹھیک کہیو" سب مہاجن کو بنانے لگتے۔ حیدر علی، فتح اللہ جلاہہ تو گیا دین کا ساتھ دیتے سمبا پاسی اور جھری چمار الہ دین عرف اُتو چوکیدار کی ہاں میں ہاں ملاتے آخیر میں سب جھری چمار کی رائے پر صاد کر دیتے۔ اسمٰعیل میاں اپنے اسامیوں کی باتیں بہت توجہ اور شوق سے سنتے اور اگر ضرورت سمجھتے تو اپنی رائے بھی پیش کر دیا کرتے تھے۔ اس دیہاتی پنچایت میں اونچ نیچ کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

(۲)

پہلے جھری کی بیوی ہی اکیلے گھر کی "ملکن" تھی سارے گھر میں اُسی کا حکم چلتا تھا لیکن جب گھر میں مَنگنو اور جیتو کی بیویاں آگئیں تو گھر کا نقشہ ہی بدل گیا پہلے جھری کے علاوہ اور کسی بھائی نے سوچا ہی نہ تھا کہ کون زیادہ کام کرتا ہے اور کون کم لیکن اب چاروں نے ایک دوسرے کے کام کا حساب لینا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ آپس میں تُو تُو مَیں مَیں بھی ہونے لگی لیکن جھری کی حکمت عملی سے گھر کی باتیں باہر نہ نکلنے پاتی تھیں جھری مرجانا پسند کرتا تھا لیکن جگ ہنسائی کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھا جب وہ دیکھتا کہ کوئی معاملہ نازک صورت اختیار کرنے والا ہے تو وہ دخل دے کر سب کو منا لیتا اپنی بیوی کو ڈانٹتا اور بھائیوں کو سمجھاتا لیکن کاغذ کی ناؤ کب تک چل سکتی ہے یہ ناممکن ہے کہ جہاں دو چار برتن ہوں وہاں کھٹ پٹ نہ ہو۔

کئی دن سے جھری کی طبیعت کچھ خراب تھی جس کی وجہ سے وہ کھیت پر بھی کام کرنے نہ جا سکا تھا شام کا وقت تھا گاؤں کے بڑے چھوٹے بچے خاک دھول میں لت پت کھیل رہے تھے۔ چراگاہ سے مویشی واپس آرہے تھے ان کے پیچھے گوالے

"برہا" گاتے چلے آرہے تھے جھری گھر میں بیٹھا ہوا ناریل پی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں منجھلے اور چھوٹے بھائی کے عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آئیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ گنگوا اور جیتوا تو کام کرتے مرے جا رہے ہیں لیکن جھری اپنی بڑائی جتا رہا ہے خود تو بیماری کا بہانہ کئے گھر میں پڑا ہے اور اس کے دونوں بھائی کھیت اور کھلیان میں دکھ اٹھا رہے ہیں بڑی بہو کا تو مزاج ہی نہیں ملتا وہ کسی کو دھیان ہی میں نہیں لاتی اب بغیر الگ ہوئے کام چلے گا جب تک ہم ساتھ رہیں گے ہماری محنتوں کا کوئی پھل نہ ملے گا" جھری ان کی باتیں سن کر سناٹے میں آگیا اس کے وہم خیال میں بھی نہ آیا تھا کہ کبھی بھائیوں میں جدائی ہوگی جھری ڈیہ ہی میں نہیں بلکہ سارے گاؤں میں جھری کے گھرانے کی تعریف کی جاتی تھی تینوں بھائیوں کے اتحاد و اتفاق سے کاشتکاری میں بڑی برکت تھی ان کے پاس اب موروثی کاشت بھی تھی اُن کے "بگر" (مویشی خانہ) میں گائیں بھینس اور بیلوں کو دیکھ کر گاؤں والے یہ سمجھتے تھے کہ چماروں کے پاس بہت دولت ہے۔ جھری نے اپنی اکلوتی بیٹی "پربتیا" کی شادی اتنی دھوم دھام سے کی تھی کہ آج تک تاج پور والے چماروں میں اس شادی کی مثال دیتے ہیں جھری نے اپنی ساری برادری کو

دعو کیا تھا۔ چار ٹولیاں تو صرف "رجھر نچوا" (ناچنے گانے والے چمار) کی تھیں کئی دن تک جشن منایا گیا تھا۔ تینوں بھائی بڑی شان سے رہتے تھے لیکن چمارنیوں کی تھکا فضیحتی سے اب وہ ساری شان نکلنے والی تھی جب جھری نے آج چمارنیوں کے منھ سے اپنی برائی سن لی تو انجام تک پہنچنے میں اُسے کچھ دیر نہ لگی اُس نے سمجھ لیا کہ اب آپس میں نباہ نہ ہوگا اگر ہم اور زیادہ عرصے تک ساتھ رہیں گے تو یہ چمارنیاں بھائیوں میں لاٹھیاں چلوائینگی مگر اب تک وہ اپنے بھائیوں کے متعلق یہی سمجھتا تھا کہ وہ جدائی کو گوارہ نہ کریں گے وہ اب تک یہی سمجھتا تھا کہ جب وہ اپنے بھائیوں سے بٹوارے کا ذکر کرے گا تو وہ اپنی عورتوں پر خفا ہوں گے لیکن رات کو جب اُس نے اپنے بھائیوں سے اس کا ذکر کیا تو اُس کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ دونوں بھائی اپنی عورتوں کے ہم خیال ہیں۔ گنگوا نے کہا "دادا! یہ روج روج کی لڑائی سے تو یہی اچھا ہوئی کی ہم الگ ہو جائی" چھوا نے بھی گنگوا کے ہاں میں ہاں ملادی۔ رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی اور جھری کو مجبوراً بٹوارہ کرنا پڑا۔ اُس نے اپنے بھائیوں سے کہدیا کہ وہ دونوں اپنی مرضی سے بٹوارہ کرلیں اس کو کوئی اعتراض نہ ہوگا

لیکن وہ یہ ہرگز پسند نہ کرے گا کہ جھگڑا یا فساد ہو اور گاؤں والوں کو ہنسنے کا موقع ملے چنانچہ نہایت خاموشی سے رات ہی کو فرار ہو گیا اور گاؤں والوں کو اس کی خبر کئی دن کے بعد ملی۔

(۳)

کچھ تو بھائیوں کی جدائی اور کچھ لڑکی کی شادی میں زیادہ خرچ ہو جانے سے جھری کی مالی حالت کمزور ہو گئی لیکن اُس نے اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے کبھی اپنے مویشی بیچ دیتا اور پھر کچھ عرصے کے بعد نئے مویشی خرید لیتا کسی دن بلا وجہ اپنے مکان کی ایک دیوار گرا دیتا اور پھر نئے سرے سے دوسری دیوار اٹھانا شروع کر دیتا تاکہ دیکھنے والے یہ ہی سمجھیں کہ جھری کے وہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہی رہتا ہے وہ سب سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتا اور ہر ایک کی مدد کے لئے تیار رہتا ایک مرتبہ بھگوان دین ملّاح کو ناؤ بنوانے کے لئے کچھ روپیوں کی ضرورت پڑی گاؤں میں کوئی قرض دینے کو تیار نہ ہوا جھری اب تک اپنی حکمت عملی سے اپنی ساکھ قائم کئے ہوئے تھا بھگوان دین نے جھری سے مدد مانگی یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا جھری کے گھر میں اُس وقت دو چار روپئے بھی فالتو نہ تھے لیکن

وہ انکار نہ کر سکا اور کہیں سے قرض مانگ کر بھگوان دین کا کام پورا کر دیا۔ تہوار کے بعد سے گاؤں والے سمجھتے تھے کہ جھری دیوالیہ ہو چکا ہے لیکن جب سب نے سُنا کہ جھری نے بھگوان دین کو قرض دیا ہے تو سب حیرت میں آ گئے۔ جھری کو نہ معلوم کتنے عرصے تک ایک وقت روکھی سوکھی روٹی کھا کر مہاجن کا قرض ادا کرنا پڑا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی اُس کو اس کی خوشی تھی کہ اُس کی ساکھ قائم رہ گئی۔

(۴۴)

جھری کی اکلوتی جوان لڑکی پر بتیا زیادہ تر اپنے میکہ ہی میں رہتی تھی اُس کا شوہر بھی اسی کے ساتھ رہتا تھا جھری فخر یہ اپنے دوستوں سے کہتا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی دوسرے گھر میں جا کر رہے میرے بعد آخر پربتیا اور میرے داماد ہی کو تو گھر بار سنبھالنا پڑے گا ان کے سوا میرا اب دنیا میں اور کون ہے۔ جھری کا خیال تھا کہ داماد کے رہنے سے اُس کو کاشتکاری میں کچھ نہ کچھ مدد مل جایا کرے گی لیکن اس کا داماد "ننکو" بالکل نکھٹو ثابت ہوا وہ کام چور اور کاہل تھا دن بھر گھر میں بیٹھا ناریل پیتا رہتا ایسے نکھٹو کی بھلا ناز و نعمت میں پلی ہوئی مست شباب پربتیا، کی

کیسے بنتی۔ پربتیا کی شکل میں کوئی خاص دلکشی نہ تھی لیکن "جوانی میں تو ہر صورت بھلی معلوم ہوتی ہے"۔ وہ آزاد تتلی کی طرح کھیتوں۔ کھلیانوں اور باغوں میں سیر کرتی پھرتی۔ جب وہ ناز سے اٹھلاتی ہوئی نیچی نظروں سے مسکراتی ہوئی چلتی تو گاؤں کے نوجوان لڑکے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے "چمرونی" میں جھری چمار کی لڑکی کو چھیڑنے کی کسی میں ہمت نہ تھی لیکن کھیتوں اور باغوں میں کون دیکھتا ہے پربتیا کی مست جوانی نے ایک جولاہے کے لڑکے "بودھی" کو اپنا شیدائی بنا لیا۔ پھاگن کا مہینہ تھا آم بورا گئے تھے اور مہوا ٹپکنے لگا تھا۔ ایک دن علی الصبح 'پربتیا' باغ میں مہوا بننے گئی تو وہاں بودھی سے پہلا "پریم ملاپ" ہو گیا پھر تو سانجھ سویرے اندھیرے اجالے جب بھی موقعہ ملتا پربتیا اور بودھی کی ملاقات ہو جاتی لیکن یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں کب تک ہوتیں ایک دن گاؤں والوں کو اِن کے پریم ملاپ کا حال معلوم ہی ہو گیا گو گاؤں میں قیامت آگئی بوڑھے جوان سب کی زبانوں پر یہ ہی چرچا تھا کہ "جھری چمار کی لڑکی ایک جولاہے سے پھنسی ہے" بدلو بھاٹ ایسے موقعوں کی تلاش ہی میں رہتے تھے وہ اس دنیا سے نرالی خبر کو لے اُڑے اور آس پاس کے دو چار گاؤں میں سُنا آئے جو لوگ جھری کی

خوش حالی اور اُس کی خودداری سے خاص طور پر جلتے تھے اُنھوں نے جھری کو مجبور کیا کہ وہ پربتیا کو اُس کی سسرال بھیج دے یہاں رہنے سے صرف چماروں ہی کی نہیں بلکہ سارے گانو کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن چماروں اور جولاہوں میں فوج داری ہو جائے۔ آخر روز روز کے طعنوں سے پریشان ہو کر جھری نے چپکے سے تاروں کی چھاؤں میں پربتیا کو داماد کے ساتھ سسرال بھیج دیا۔

جھری کی اُٹھی ہوئی گردن اب جھک گئی ہے۔ اب وہ چھاتی پھلا کر نہیں چلتا گانو اور سماج کے خیال سے پربتیا نے ایک جولاہے سے پریم کر کے جھری کی ساکھ کی دیوار ہمیشہ کے لئے کھوکھلی کر دی ہے لیکن جھری اب بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے وہ اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے اب بھی کوئی نہ کوئی نیا کام کئے ہی جاتا ہے جب بھی اُسے کھیت کھلیان سے فرصت ملتی ہے وہ ہاتھ میں کھُرپا یا پھاوڑا لے لیتا ہے اور پُرانی دیواروں کو گرا گرا کر نئی نئی دیواریں کھڑی کرتا رہتا ہے۔

لکشمی

آگرہ سے چار میل اُتر جانب ایک گاؤں لکھن پور میں لالہ بدری پرشاد مہاجنی کرتے تھے۔ اچھے خاصے دوہرے بدن کے آدمی تھے۔ ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ مگر دوسرے تیسرے مہینہ گاڑھے کا کرتا گاڑھے کی دھوتی اور گاڑھے کی دوپلی ٹوپی ان کی پوشش تھی۔ مہاجنی پیشے کے لوگوں میں جو جو خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں اپنی ڈیوڑھی میں ایک پھٹی پرانی گدی پر بیٹھے سود بڑھانے کی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔ غرضکہ ان کو اس دنیا میں روپیہ جمع کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ اُنھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے پرکاش نرائن کو بھی مہاجنی کا کام سکھانا چاہا تھا

لیکن اس نے اسے پسند نہ کیا اور اپنی کوشش اور محنت سے انٹرنس
پاس کر لیا۔ اس کے بعد بھی اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا
چاہا۔ لیکن اس کے باپ نے اجازت نہ دی بلکہ پرکاش نرائن کو
اور زیادہ پابند کرنے کے لئے اس کی شادی کر دی۔ خوش قسمتی سے
پرکاش نرائن کو بیوی بہت حسین، سلیقہ مند اور پڑھی لکھی ملی۔ شگفتہ
چہرہ، سُرخ سُرخ ہونٹ، صاف اور روشن آنکھیں، بڑی ہنس مکھ
سب لوگ اُسے گھر کی "لکشمی" سمجھتے۔ اس دنیا میں عیش و غم میں چولی
دامن کا ساتھ ہے۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ شادی کے چار پانچ مہینے
کے اندر ہی پرکاش نرائن کے ماتا پتا سرگباش ہو گئے۔ پرکاش نرائن
ناتجربہ کار تھا۔ باپ کی جو کچھ کمائی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئی
اُنھوں نے حصول ملازمت کے لئے بہت کوششیں کیں۔ روزگار
ملنے تک اخراجات کم کرنے کی بھی کئی ترکیبیں سوچیں۔ لیکن سب
بے سود، نہ آمدنی بڑھانے کی صورت پیدا ہوئی۔ نہ اخراجات گھٹانے
کی۔ عزیز و اقارب ایسے سنگدل نکلے کہ مدد کرنا تو دور رہا۔ جو کچھ پرکاش
نرائن کے گھر میں اثاثہ تھا وہ ایسا دبایا کہ اس کو پتہ تک نہ لگنے
دیا۔ ایسے نازک وقت لکشمی نے عورت ذات ہو کر بڑی ہمت
اور استقلال سے کام لیا۔ لیکن مفلسی اور بے کاری اس عالم آفات

میں ایسے آزار ہیں جن سے شریف آدمی کو ہر وقت پناہ مانگنی چاہیئے
رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آگیا جب پرکاش نرائن کے گھر میں
پھوٹی کوڑی بھی خرچ کرنے کو نہ رہی ۔

چیت کا مہینہ تھا کھلیانوں میں اناج کے انبار لگے ہوئے
تھے۔ ساری دنیا خوش حال تھی۔ کسانوں کی چاندی تھی۔ کسانوں
کے مزاج نہ ملتے تھے۔ ان کے دروازوں پر ہر وقت گاہکوں کا
جمگھٹ لگا رہتا تھا درزی کو سر اُٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ بھاٹ
اور بھکاری بھی خوش و خرم نظر آتے تھے۔ لیکن پرکاش نرائن کے
گھر میں غریبی اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھی ۔

ایک دن شام کو ڈھلتی ہوئی چھاؤں میں لکشمی آنگن میں
بیٹھی ہوئی اپنی پھٹی پرانی ساری میں پیوند لگا رہی تھی۔ ٹھیک
اُسی وقت پرکاش نرائن گھر میں داخل ہوئے ان کے ساتھ ایک
نوجوان شخص بھی تھا۔ غیر مرد کو دیکھ کر لکشمی نے لمبا گھونگھٹ کاڑھ
لیا اور جلدی سے اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ پرکاش نرائن
برآمدے میں بیٹھ کر اپنے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ جب تھوڑی
دیر کے بعد نو وارد چلا گیا تو پرکاش نرائن نے لکشمی کو پکارا۔
"جی سنتی ہو؟"

لکشمی نے کمرہ سے نکل کر کہا "کیا حکم ہی؟"

"میں کل سویرے آگرہ جاؤں گا۔"

"کیوں"

"کیوں؟ ...... لکشمی میں اس کا کیا جواب دوں۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ہمارے گھر کا کیا حال ہی۔ اب چپ چاپ یہاں بیٹھنے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ آگرہ بڑا شہر ہی دہاں تلاش کرنے سے مجھے کوئی نہ کوئی نوکری ضرور مل جائے گی۔ اس وقت میرے ساتھ جو ایک بابو آئے تھے۔ یہ ہمارے گاؤں کے مکھیا کے لڑکے ہیں۔ ان کا نام بیجناتھ ہی۔ بے چارے بڑے اچھے آدمی ہیں انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہی کہ آگرہ میں نوکری دلائیں گے۔ وہاں رئیسوں سے ان کا بڑا میل ہی۔

لکشمی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ جب تم آگرہ چلے جاؤ گے تو میں اس گھر میں تنہا کیسے رہوں گی۔

اس کی تم کچھ پروا نہ کرو۔ ایشور مالک ہی۔ میری عدم موجودگی میں بابو بیجناتھ تمھاری خبر لیتے رہیں گے۔ نوکری ملے یا نہ ملے ہر ہفتہ تم سے آکر مل جایا کروں گا۔ ہاں میں تم سے کہنا بھول گیا کہ بابو بیجناتھ سے میں نے دس روپیہ قرض مانگے تھے انھوں نے

دینے کا وعدہ کیا ہے وہ روپیہ لینے گئے ہیں۔ بس اب آتے ہی ہونگے
شام ہو رہی ہے تم ذرا چراغ جلا دو اور ایک چارپائی آنگن میں
ڈال دو۔ ہم لوگ آنگن میں ہی بیٹھیں گے۔

کچھ دن پانی نہ ملنے سے جس طرح دھان کی پتیاں خشک ہو کر زرد پڑ جاتی ہیں مگر پانی پاتے ہی ان میں سے سبزے کا رنگ لہرانے لگتا ہے اسی طرح لکشمی کی بھری جوانی پر مفلسی کا سایہ پڑ جانے سے سونا کانچ کی شکل اختیار کرتا جاتا تھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ جو رنج و فکر سے پیلا پڑ گیا تھا آج مدت کے بعد اپنے پتی کو خوش دیکھ کر کنول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے جلدی سے چراغ جلایا اور چارپائی آنگن میں بچھا دی۔ پرکاش نرائن نے مسکرا کر کہا "لکشمی تمھاری ایسی محبت کی دیوی کو پا کر مجھے تکلیف میں بھی راحت ہے"۔

لکشمی کچھ جواب ہی دینے والی تھی کہ بابو بیجناتھ آ گئے اور وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔ پرکاش نرائن نے کہا "آیئے بابو جی میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"۔

چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بابو بیجناتھ نے جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکالا۔ اور پرکاش نرائن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پرکاش نرائن نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "بھگوان آپ کو بنائے رکھے"۔

بابو بیجناتھ نے تھوڑی دیر بیٹھ کر کہا "اچھا اب میں جاتا ہوں کل آگرہ جانے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لینا میں اپنے بھائی کے نام تم کو ایک سفارشی خط دوں گا۔ میرے بھائی آگرہ میں وکالت کرتے ہیں وہ تمہاری بہت مدد کریں گے" اتنا کہہ کر بابو بیجناتھ چلنے کو تیار ہوئے۔ لیکن ابھی انھوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا کہ پرکاش نرائن یکبارگی چلا اُٹھا۔

"سانپ! سانپ! بابو جی بچنا۔ لکشمی دوڑ۔ جلدی چراغ لا" بابو بیجناتھ ٹھٹک کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ گو انھوں نے سانپ کو نہیں دیکھا تھا پھر بھی وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ لکشمی ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے گھبراہٹ میں کمرے سے نکل آئی اس وقت اس کو پردہ کا کچھ خیال نہ تھا اُس کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹ گیا۔ اور جس طرح پورن ماشی کا چاند بادلوں سے نکل کر تمام دنیا کو منور کر دیتا ہے۔ اسی طرح لکشمی کا چندر مکھ گھونگھٹ کو ہٹا کر اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا رہا تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی اُس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ خود سر مگر بیتاب سیاہ ریشمی نرم بالوں کی لٹیں سینے پر کالی ناگنوں کی طرح لہرانے لگیں بابو بیجناتھ یہ حسن کا عالم دیکھ کر بیخود ہو گئے۔ شعلے لپکتے ہیں مگر

یوں نہیں۔ بجلیاں چمکتی ہیں مگر اس طرح نہیں جس طرح لکشمی کے بے نقاب چہرے نے اپنی چمک سے بابو بیجناتھ کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی۔ اس تمام عرصہ میں پرکاش نرائن ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہوئے سانپ ہی کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن وہ نہ ملا۔ آخرکار تھک کر اُس نے بیجناتھ سے کہا "بابوجی! بڑی خیریت ہوئی آپ بچ گئے۔"

بیجناتھ نے کہا "ہاں" لیکن ان کا دل کہہ رہا تھا کہ "میں اس سانپ سے بھی زیادہ خطرناک۔ اس سے زیادہ خوبصورت "ناگن" کا شکار ہو گیا ہوں۔"

بابو بیجناتھ کو ان کے گھر پر پہنچا کر جب پرکاش نرائن واپس ہوا تو لکشمی نے اداس ہو کر کہا "یہ شگون تو اچھا نہیں ہوا ہے۔"

"کیسا شگون؟"

"ناگ دیوتا کا گھر میں آنا خالی از علت نہیں۔"

"تم کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ میں ان کو نہیں مانتا۔"

صبح ہوتے ہی جب پرندے چہچہانے لگے اور ساری دنیا

بیدار ہو گئی تو پرکاش نرائن بھی رام ناتھ جپتا ہوا اُٹھا۔ جلدی جلدی اشنان کیا اور کپڑے پہنے۔ اس عرصہ میں لکشمی گھر میں جو کچھ دال دلیا موجود تھا اس کا ناشتہ بنا کر لائی۔ کھا پی کر پرکاش نرائن لکشمی سے رخصت ہوا۔ اور بیجناتھ کے پاس پہنچا۔ بیجناتھ سے سفارشی خط لے کر پرکاش نرائن نے کہا "اچھا بابو! اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ لیکن گھر بار آپ پر چھوڑے جاتا ہوں اس کا خیال رکھئے گا"۔

بیجناتھ نے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم اس سے بے فکر رہنا"۔

پرکاش نرائن کو جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو لکھن پور سے آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد بیجناتھ نے نئے کپڑے پہنے۔ آنکھوں میں سرمہ اور بالوں میں تیل لگایا جب وہ اچھی طرح بن سنور چکا تو ٹہلتا ہوا پرکاش نرائن کے گھر پہنچا۔ اس وقت لکشمی آنگن میں بیٹھی ہوئی برتن مانجھ رہی تھی۔ بیجناتھ کو دیکھ کر اُس نے راکھ والے ہاتھ کی ایک چٹکی سے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ بیجناتھ کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا پھر کہنے لگا۔

"بھابھی! تم مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہو میں تو پرکاش نرائن کا چھوٹا بھیا ہوں"۔

لکشمی اسی طرح سر جھکائے برتن مانجتی رہی۔ اس نے کچھ جواب دیا۔

کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد بیجناتھ نے جیب سے ایک دس روپئے کا نوٹ نکالا اور لکشمی کی طرف پھینک کر کہا "یہ لو دس روپئے اور جو کچھ تم کو خرچ کے لئے ضرورت ہو گی۔ میں برابر دیتا رہوں گا۔ تم مجھے غیر نہ سمجھنا۔"

بیجناتھ کو لکشمی اپنا محسن اور سرپرست سمجھتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اب وہ کچھ جواب نہ دے گی تو بیجناتھ کی دلشکنی ہو گی۔ اس نے دبی آواز سے کہا "بابو جی، مجھے خرچ کی بالکل ضرورت نہیں وہ مجھے آج اتنا دے گئے ہیں جس میں مہینہ بھر کا خرچ بخوبی چلا سکتی ہوں۔"

بیجناتھ نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں یہ روپے قرض نہیں دے رہا ہوں پرکاش نرائن بھیا میرے دوست ہیں۔ وقت پڑنے پر مجھے حق ہے کہ میں ان کی امداد کروں۔"

دنیا کی آلائش سے پاک۔ بھولی بھالی لکشمی نے مجبوراً وہ نوٹ لے لیا۔ ایک مرتبہ احسان لے کر انسان کو ہمیشہ احسانمند بننا پڑتا ہے۔ لکشمی نے یہ سوچ کر نوٹ واپس کرنے سے کہیں اس کا شوہر خفا نہ ہو۔ بیجناتھ کا کہنا مان لیا۔

بیجناتھ نے کہا: "بھابھی! پیاس لگی ہے ذرا پانی تو پلا دو۔"
لکشمی نے گلاس دھوکر پانی بھرا۔ اور بیجناتھ کو دیا۔

بیجناتھ نے جب لکشمی کے ہاتھ سے گلاس لیا تو اُس نے قصداً اُسکی اُنگلی دبا دی۔ لیکن نیک دل، پاک طینت لکشمی نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اس نے سوچا کہ اتفاقاً غلطی سے ایسا ہوا ہے۔

اس دن کے بعد سے بیجناتھ روزانہ کسی نہ کسی وقت لکشمی سے بات چیت کر جاتا۔ لکشمی بھی اب کچھ بے تکلف ہو گئی تھی۔ لیکن بے پروا نہ تھی۔ ایک دن بیجناتھ نے لکشمی سے محبت آمیز باتیں کیں۔ اس دن لکشمی شرم سے پانی ہو گئی اور اُس کے دل میں بیجناتھ کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اب وہ دن کے وقت زیادہ تر ڈپٹی کے ہاں رہتی اور رات کو اپنے گھر میں قفل لگا کر سو جاتی۔ بیجناتھ حسبِ معمول آتا۔ لیکن جس طرح بند دروازے کے سامنے کوئی فقیر بھیک مانگے اور کچھ نہ پاکر واپس چلا جائے۔ ٹھیک اسی طرح لکشمی سے ملاقات نہ ہونے پر بیجناتھ شکستہ دل ہو کر اپنے گھر واپس چلا جاتا۔ رنج وغم اور ناکامی نے بیجناتھ کو پاگل بنا دیا اور وہ لکشمی سے اس کا بدلہ لینے کے لئے تیار ہو گیا۔

(۳)

پرکاش نرائن کہہ گیا تھا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر واپس آ جائے گا لیکن بیس دن گزر گئے نہ تو کوئی خط ہی آیا اور نہ اس کی کوئی خبر ہی ملی۔ مجبوراً لکشمی انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ اس کے دل میں عجیب و غریب خیالات آتے اور وہ آسمان کی طرف دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر کرشن بھگوان سے اپنی پتی کے لئے پرارتھنا کرنے لگتی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ صبح کا سہانا وقت تھا۔ لکشمی ایک ہاتھ پلنگ پر ٹیکے ہوئے کچھ بیٹھی اور کچھ لیٹی ہوئی پرکاش نرائن کی یاد میں مگن تھی۔ اتفاق سے دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بیجناتھ کو موقع مل گیا اور وہ دبے پاؤں اندر آ گیا۔ لیکن لکشمی نہ دیکھ سکی۔ کیونکہ اس کی پشت دروازہ کی طرف تھی۔ اس وقت لکشمی عجیب محویت کے عالم میں تھی سر کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ دھوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپٹ گئی تھی اور نیمہ آستین اپنا قرض ٹھیک طور سے ادا نہیں کر رہی تھی۔ بال اپنی مقررہ حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور کوئی سزا دینے والا نہ دیکھ کر انھوں نے نصف آفتاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ بیجناتھ کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ سب بناؤ اسی کو تڑپانے کے لئے کئے گئے ہیں۔ ہزار

کوشش کرنے پر بھی اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ آگے بڑھ کر لکشمی کی بلائیں لے لے یہ سوچ کر اس نے اپنا قدم آگے بڑھایا۔ لیکن اب لکشمی نے دل دیکھ لیا خوف و شرم سے اس کا چہرہ غروب ہونے والے آفتاب کی طرح سُرخ ہو گیا وہ پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کچھ کہے سُنے گھر سے باہر نکل جانا چاہا۔ لیکن بیجناتھ نے راستہ روک کر کہا۔ "ٹھہرو! کہاں جاتی ہو۔ ذرا میری ایک بات تو سُن لو"۔

"نہیں نہیں! میں ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے جانے دیجئے میری عزّت پر رحم کیجئے۔ شریف ہو کر شرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے اگر کوئی آپ کو میرے گھر میں دیکھ لے گا تو بڑی بدنامی ہو گی"۔

"مجھے بدنامی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں تمھاری محبّت میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ تم اس ٹوٹے پھوٹے مکان کو چھوڑ دو۔ چلو میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو عالی شان مکان میں رکھوں گا۔ تمھارے خوبصورت بدن پر یہ پھٹے پُرانے چیتھڑے اچھے نہیں معلوم ہوتے میں ان سے اچھی قیمتی پوشاک بنوا دوں گا۔ بیش قیمت گہنوں سے لاد دوں گا۔ پیاری لکشمی بو"

پتی ورتا لکشمی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کے تن بدن

میں آگ لگ گئی۔ اپنی عزّت کو خطرے میں دیکھ کر چلاّ اٹھی "چپ! چپ! پاپی چپ رہ! تو میرے گھر سے نکل جا۔ تو مجھے لالچ کے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ سبز باغ ان بیسواؤں کے لئے ہے جو دولت کو ایمان دین سمجھتی ہیں۔ جن کا ایشور دولت ہے۔ تیری مکر و فریب کی باتیں انھیں عصمت فروشوں کو اپنے قبضہ میں لا سکتی ہیں لیکن تو تو میری آنکھوں میں دنیا بھر سے ناپاک ہے۔ میرا یہ پھوس کا جھونپڑا میرے لئے راج محل سے بڑھ کر ہے"

اگر کوئی بات حقیقت کا پہلو لئے ہوتی ہے تو وہ مخاطب کے دل پر نشتر کی طرح لگتی ہے لکشمی کا ایک ایک فقرہ بیجناتھ کے دل پر چھری اور تلوار کا کام کر گیا۔ غصہ میں آکر بیجناتھ نے جیب سے ایک بڑا شکاری چاقو نکالا اور کہا "اگر تو میرا کہنا نہ مانے گی تو میں تیرا خون کر دوں گا"

لکشمی نے حقارت سے ہنس کر جواب دیا "چنڈال! میں موت سے نہیں ڈرتی۔ میرے نزدیک موت ایک ایسا خواب ہے ایسا پاک اور آرام دہ خواب جہاں تجھ ایسے ناپاک دنیا کے کتوں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا"

تو نے مجھے مجبور کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہی تیری شرافت کی روشن مثال ہے۔ سچ بتا کیا کمزور۔ بیکس اور غریب عورتوں کے ساتھ بہادر ایسا سلوک کرتے ہیں۔ شرم! شرم!! ایسے اچھی طرح سمجھ لے کہ پاک دامن عورت جان پر کھیل جانا بہت زیادہ پسند کرے گی۔ بہ نسبت اس زندگی کے جو موتی ایسی عصمت کو بیچ کر خریدی جائے "۔

یہی کہتی ہوئی لکشمی نے باہر نکل جانے کی کوشش کی۔ مگر بیجناتھ نے اپنا دست ہوس بڑھایا اور لکشمی چیخ کر پیچھے ہٹی۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ جس کو بیجناتھ بند کرنا بھول گیا تھا۔ کھلا اور پرکاش نرائن بغل میں ایک گٹھری دبائے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی لکشمی چلا اٹھی۔" جیون ادھار۔ پرمیشور! مجھے اس پاپی سے بچاؤ "۔ چور کا دل ہی کتنا بڑا ہوتا ہے۔ بیجناتھ ڈر کے مارے کانپنے لگا اور پرکاش نرائن کے قدموں پر یہ کہتا ہوا گر پڑا۔" پرکاش مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا۔ میں اپنی نگاہوں میں خود ذلیل ہوں۔ لکشمی ایسی پاک دیوی کو ورغلانا چاہا۔ ہائے میں ایشور کو کیا منھ دکھلاؤں "۔ یہ کہہ کر بیجناتھ زار زار رونے لگا روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ بادل برس چکنے پر جس طرح

مطلع صاف ہو جاتا ہی اور سورج اپنی آب وتاب سے چمکنے لگتا ہی۔
اسی طرح جی بھر کر رو لینے کے بعد بیجناتھ کے گناہ کا بہت سا حصہ
دُھل گیا۔"

پرکاش نرائن نے صرف اتنا کہا "اچھا بابو جی میں نے
معاف کیا۔ لیکن اب کبھی ہم لوگوں کو اپنا منہ نہ دکھائیے گا۔ میں
آپ کا روپیہ کل آپ کے مکان پر بھیجدوں گا۔" مجھے نوکری مل گئی
ہی۔ میں لکشمی کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ بیجناتھ ندامت سے
سر جھکائے پرکاش نرائن کی شرافت کی دل ہی دل میں تعریف
کرتا ہوا جلدی سے باہر نکل گیا۔

بیجناتھ کے جانے کے بعد پرکاش نرائن نے آگے بڑھ کر
پتی ورتا لکشمی کو اپنے کلیجہ سے لگا لیا۔ فرط محبت سے لکشمی اپنے پرمیشور
کی گود میں گر پڑی۔ اس وقت اس کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ سرگ
میں لیٹی ہوئی ہی۔ اور اس کے تلوے سرگ کی اپسرائیں سہلا رہی
ہیں۔

منزل

صفدر علی ہمارے رشتہ دار نہ تھے پھر بھی گاؤں کے تعلق سے میں انھیں ماموں کہتا تھا سنتا ہوں کہ ان کے آباؤ اجداد نے اچھے دن دیکھے تھے لیکن میں نے جب سے ہوش سنبھالا صفدر ماموں کو مفلوک الحال ہی دیکھا۔ دو چار بیگھے موروثی کاشتکاری تھی اس میں ان کی بھلی یا بُری بسر اوقات ہو جاتی تھی گھر میں ان کے سوا ان کی بیوی اور ان کا اکلوتا لڑکا ہمت علی تھا۔ صفدر ماموں تھے تو دیہاتی لیکن ان کی شادی شہر میں ہوئی تھی اِن کی بیوی جب پہلے پہل گاؤں میں آئیں تو بہت گھبرائیں۔ شیرنی جب پنجرے میں بند ہوتی ہے تو باہر نکلنے کے لئے بہت تڑپتی ہے

لیکن رفتہ رفتہ اُسے پنجرے کے کسی نہ کسی گوشہ میں سکون ملنے لگتا ہے مُمانی بولتی تھیں شُستہ اور سلیس اُردو اس کے برخلاف صفدر ماموں کی بولی دیہاتی تھی کچھ دن خوب لاگ ڈانٹ رہی مومانی جب بگڑتیں تو صفدر ماموں کو اُجڈ اور گنوار بنا دیتیں۔ کچھ عرصہ تک تو صفدر ماموں خدا جانے کس مصلحت سے خاموش رہے لیکن "سو سُنار کی تو ایک دن لُہار کی" ایک دفعہ جو دیہاتی ماموں کو جلال آیا تو اُنھوں نے وہ لے دے کی کہ شہری مُمانی سب "واللہ! باللہ" بھول گیئں اور پھر شاید اُنھوں نے کبھی صفدر ماموں سے "جنگ عظیم" مول نہیں لی۔ دیہات میں رہتے برسوں گذر گئے اب مُمانی دیہاتی اور شہری ملی جلی بولی بولتی ہیں صرف زبان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی وہ شہر میں رہی ہوں گی۔ ورنہ اب تو دیہاتی معاشرت میں رنگی نظر آتی ہیں۔

صفدر ماموں بڑے محنتی اور جفاکش کسان تھے جس سال ہمارے گاؤں میں اچھی فصل ہو جاتی تو گاؤں کے کنجوس بنئے بھی اپنے بچوں کو پڑھانے کے لئے تیار ہو جاتے صفدر ماموں جو کچھ ہندی پڑھے لکھے تھے وہ اس زمانے میں "گرو جی" بن جاتے اس طرح سے بھی دو چار روپیہ کی آمدنی ہو جاتی تھی۔ جب تک

والد صاحب ملازمت پر رہے صفدر ماموں ہی ہمارے گھر کے مختار عام رہے لیکن جب والد صاحب ملازمت چھوڑ کر گھر آ گئے اور انھوں نے اپنی زمینداری کا کام خود سنبھالا تو صفدر ماموں کا وہ عہدہ چھین گیا۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ والد صاحب ہمارے صفدر ماموں کا خاص خیال رکھتے تھے والدہ صاحبہ ان کو اپنا بھائی کہتی تھیں۔ اسی رشتہ سے ہم سب بھائی ان کو صفدر ماموں کہنے لگے تھے۔

جوانی میں صفدر ماموں پہلوانی کرتے تھے بڑا کسرتی جسم پایا تھا لیکن ایک مرتبہ کا ذکر ہے شاید بھادوں کا مہینہ اور ناگ پنچمی کے دن تھے جھوم جھوم کر بادل آتے اور جھما جھم برس کر نکل جاتے تھے چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی کھیتوں میں دھان لہلہا رہے تھے باغوں میں آموں اور جامنوں کی بہار تھی ہمارا گاؤں گنگا جی کے کنارے ایک نہایت ہی پر فضا مقام پر واقع ہے برکھا رت اور گنگا جی کا کنارہ ہر دیہاتی مست و بے خود ہو رہا تھا۔ غریب دیہاتی بچوں کو تن پوشی کے لئے مشکل سے دو انگل کپڑا نصیب ہوتا ہے لیکن یہ تو بھادوں کا مہینہ تھا ڈنڈ بیٹھک اور اکھاڑوں کے دن تھے لنگوٹ میں کپڑا ہی کتنا

لگتا ہے۔ جس بچے یا جوان کو دیکھئے لنگوٹ کسے اپنی پہلوانی کا اظہار کر رہا ہے تو ایسے ہی یہ بہار موسم میں گنگا کے اس پار دنگل تھا ایسے موقع پر صفدر ماموں کیسے نہ جاتے اب وہ جوان نہ تھے کشتی بھی نہ لڑتے تھے لیکن اکھاڑہ کے کنارے کھڑے ہو کر وہ "پٹھوں" کا دل تو بڑھا سکتے تھے وہ بھی تماشائی کی حیثیت سے دنگل میں پہنچ گئے لیکن وہاں وہی مثل ہوتی "کر کر چھوڑ جلا ہے جائے ناحق مار بیچارا کھائے" پہلوانوں میں نہ جانے کس بات پر لاٹھی چل گئی اور صفدر ماموں بے کار بُری طرح سے پٹ گئے بڑی مشکلوں سے لوگ انھیں چارپائی پر لاد کر گاؤں واپس لائے کئی مہینے تک دیہاتی علاج ہوتا رہا زندگی تھی بچ گئے لیکن اُن کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئی۔

صفدر ماموں اپنے اکلوتے لڑکے ہمت علی کو بہت چاہتے تھے وہی ان کے گھر کا چراغ تھا ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلائیں گاؤں میں کوئی مدرسہ نہ تھا وہاں سے چھ سات کوس پر ایک قصبہ تھا جہاں صفدر ماموں کی کوئی رشتہ داری تھی انھوں نے ہمت علی کو وہیں اردو پڑھنے کے لئے بھیج دیا ہر مہینہ صفدر ماموں سر پر آٹے دال کی گٹھری لاد کر اپنے بچے کے

کھانے پینے کا سامان قصبہ میں دے آتے کاشتکاری میں مشکل سے گذر ہوتی تھی اور اب تو وہ اپنے لڑکے کو تعلیم دلا رہے تھے جتنی بھی تنگی ہوتی کم تھی لیکن صفدر ماموں کی ہمّت کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ تعلیم کے سامنے اُنھوں نے کسی تکلیف کی کوئی پرواہ نہ کی۔ چل چلاتی دھوپ میں دوپہر کے وقت جب "ہرواہے" (ہل چلانے والے) بیلوں کو کھول دیتے اور کھانے پینے اور کچھ دیر سستانے کے لئے کسی سائے کے نیچے چلے جاتے تو بھی صفدر ماموں آرام نہ کرتے انھیں تو بس ایک ہی دھن اور ایک ہی لاگ تھی ہمت علی جلد سے جلد پڑھ لکھ کر قابل بن جائے تاکہ ان کے بگڑے دن بن جائیں۔ جس سال ہمت علی نے اُردو کا درجہ چہارم پاس کیا تو صفدر ماموں کا دماغ چرخ چہارم تک پہنچ گیا ان کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی وہ سمجھنے لگے کہ وہ ترقی اور کامیابی کی منزل پر پہنچ گئے لیکن میری غلطی سے ان کا یہ خیال دور ہو گیا میں زمیندار کا لڑکا ہوں ہر قسم کی آسائشیں مجھے نصیب ہیں میں دیہاتی مدرسہ میں کیوں پڑھتا میں شہر میں ایک انگریزی اسکول میں تعلیم پا رہا تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گاؤں آیا ہوا تھا جب صفدر ماموں سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے مجھے خوش خبری

سنائی کہ ہمت علی نے "درجہ چار" پاس کر لیا مجھ سے ان کی یہ خوشی نہ دیکھی گئی اور میری زبان سے نکل گیا کہ "تو اس سے کیا ہوتا ہے جب تک ہمت علی ٹدل پاس نہ کر لیں گے اور انگریزی پڑھ نہ لیں گے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا" صفدر ماموں سمجھتے تھے کہ میں خوشی کا اظہار کروں گا لیکن اس کے بجائے میں نے ان کا دل توڑ دیا وہ میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے مدتوں کا بنایا ہوا قلعہ زمین پر گر گیا ریت کی دیوار ہو اکے ایک ہی جھونکے میں بیٹھ گئی بڑی مشکلوں سے تو انھوں نے ہمت علی کو درجہ چہارم تک پڑھایا تھا اور میں نے ٹدل اور انگریزی کی شرط لگا کر "ہنوز دلی دور است" کا معاملہ کر دیا رشک کا مادہ ہر انسان میں ہوتا ہے لیکن صفدر ماموں اس معاملہ میں سب سے نرالے تھے وہ زمین پر لیٹ کر آسمان کو چومنے کی خواہش رکھتے تھے ایسے موقع پر وہ پاؤں پھیلانے میں اپنی چادر کی وسعت کو بھی بھول جاتے تھے دوسرے دن وہ علی الصبح ہمت علی کو میرے پاس لائے اور کہنے لگے "بیٹا! جرا اپنے اس بھائی کو بھی انگریجی پڑھائے دیا کرو" میں اپنی ہی پڑھائی سے بہت پریشان تھا مجھے خود پڑھنا مصیبت تھی اس دوسری مصیبت کا کیسے سامنا کروں گا لیکن صفدر ماموں کی بزرگی

اور ان کی خوشامد کے سامنے میں مجبور ہو گیا صبح ہوتے ہی صفدر
ماموں اپنے لختِ جگر کو ساتھ لے کر میرے یہاں آجاتے لڑکا پڑھتا
اور وہ غور سے سنتے رہتے کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا کہ ہمت علی
پڑھنے میں اٹک جاتا میں تو خفگی کا اظہار بھی نہ کرتا لیکن صفدر
ماموں بلا تکلف ہمت علی کے منھ پر دو چار طمانچے رسید کر دیتے
گویا پڑھانے کے لئے تو میں تھا اور سزا دینے کے لئے صفدر ماموں
ان کو تو جلد از جلد منزل تک پہنچنے کی بڑی تھی وہ چاہتے تھے
کہ ہمت علی کو انگریزی گھول کر پلا دیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ
اپنے گھر پر ہمت علی سے کہتے کہ کتاب کھول کر پڑھو سعادت مند
بچہ باپ کے حکم کی تعمیل کرتا صفدر ماموں انگریزی تو کیا اردو
سے بھی ناواقف تھے لیکن وہ بڑی شان سے ادھر یا جھاڑو کی
تیلی ہاتھ میں لے کر سبق سننے کو بیٹھ جاتے اگر اتفاق سے ہمت علی
پڑھنے میں کہیں رک جاتا تو صفدر ماموں سمجھتے کہ وہ اپنا سبق بھول
گیا اور پھر اس کو ٹھوکنا شروع کر دیتے میں نے انھیں کئی مرتبہ
سمجھایا بھی کہ اس طرح بلا خطا قصور مارنے سے بچے پڑھ نہیں
سکتے مگر صفدر ماموں پر میرے کہنے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا
وقت ناوقت ناکردہ گناہ ہمت علی پر مار پڑ ہی جاتی۔ وہ ہر دسے

ہمت علی کو سمجھانے کہ جس طرح زمیندار کا لڑکا چلتا پھرتا، اٹھتا اور بیٹھتا ہے تم بھی اسی طرح سیکھ لو تم کو ایک دن بڑا آدمی بننا ہے۔

جب گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو ہوئیں تو ایک دن پتہ چلا کہ صفدر ماموں اپنے لڑکے کو تحصیلی اُردو مڈل اسکول میں داخل کرانے کو لے گئے ہیں دو چار دن بعد ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمت علی کا داخلہ ہو گیا ہے۔ اب تو صفدر ماموں کو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے بس اسی بات کی فکر تھی کہ کھیت کی پیداوار بڑھ جائے تاکہ ہمت علی کے پڑھانے کا خرچ پورا ہو وہ اب کولھو کا بیل بن گئے تھے۔ کھیت کھلیان اور ہمت علی کا خرچ پورا کرنا بس یہی ان کی زندگی کا مقصد رہ گیا تھا۔

مڈل کا آخری سال تھا سالانہ امتحان میں تین چار مہینے باقی تھے صفدر ماموں کبھار کے کسی کھیت میں "جواسہ" گوڑ رہے تھے کہ ان کے پاؤں میں کوئی بڑا کانٹا لگ کر ٹوٹ گیا کسانوں کے لئے جو ننگے پاؤں چلتے پھرتے ہیں کانٹا لگنا معمولی بات ہے مگر نہ معلوم کس بُری ساعت سے صفدر ماموں کو کانٹا لگا کہ وہ اُن کے لئے بلائے جان ثابت ہوا پھر بھی کچھ دنوں تک اُنھوں نے

کھیت کا جانا نہ چھوڑا۔ اُٹھتے بیٹھتے رُکتے اور ستاتے ہوئے صفدر ماموں کھیت پر پہنچ ہی جاتے گانو والوں نے بہت سمجھایا کہ کچھ دن آرام کر لیں ورنہ زخم بڑھ جائے گا مگر صفدر ماموں ایسے مسافر نہ تھے جو منزل کے قریب پہنچکر ہمّت ہار دیتے یہی تو آخری سال ہے اگر چند مہینے اور وہ ہمّت علی کی فیس اور کھانے پینے کا انتظام نہ کر سکے تو پھر ہمّت علی "بڑا آدمی نہ بن سکے گا" ان کو اپنی پرواہ نہیں وہ رہیں یا نہ رہیں مگر ان کا نام تو روشن ہو جائے گا۔ لیکن جب زخم میں پیپ پڑ گئی تو صفدر ماموں چلنے پھرنے سے مجبور ہو گئے کچھ دنوں تک تو ارنڈ اور نیم کی پتیوں ہی کا لیپ ہوتا رہا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا زخم سے روزانہ خون اور پیپ کے بہنے سے صفدر ماموں کی حالت خطرناک ہو گئی وہ سوکھ کر خود کانٹا بن گئے جب گانو کی سب دوائیں بے کار ثابت ہو گئیں، تو صفدر ماموں مجبوراً ڈولی میں سوار ہو کر شہر پہنچے اور وہاں ایک خیراتی اسپتال میں داخل ہو گئے وہاں ایسے مفلس کسانوں کو کون پوچھتا کسی ڈاکٹر نے شاید کہا بھی کہ زخم میں کیڑے پڑ چکے ہیں پانو کاٹنا پڑے گا لیکن صفدر ماموں نے انکار کر دیا۔ جب صفدر ماموں کی حالت نازک ہو گئی تو

کسی نے کہا "کہو تو ہمت علی کو بلوا دیں" مگر صفدر ماموں نے جھڑک دیا۔ "نہیں! اوکا نہ بلاؤ ..... یہی تو آخری سال ہے ...... امتحان قریب ہے ......

ہمت علی کو باپ کی نازک حالت کا علم نہ تھا۔ وہ مڈل کا امتحان دے کر گاؤں کو واپس ہوا لیکن ابھی اُس نے گھر کی دہلیز ہی پر قدم رکھا تھا کہ اندر سے صفدر ماموں کا جنازہ نکلا۔ بہرطور وہ اپنی "منزل" پر پہنچ چکے تھے۔

شیخ و برہمن

ڈاکٹر اعظم کریوی نے عرصۂ دراز تک
دیہاتوں میں زندگی گذاری تاکہ وہاں کے رسم
و رواج، دکھ سکھ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات
کا بغور مطالعہ کرسکیں، ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ
دیکھا اُسے موثر کہانیوں کے پیرایہ میں پیش
کر دیا، یہی وجہ ہو کہ ان کے افسانوں میں دیہات
کا دل دھڑکتا ہوا سنائی دیتا ہو، وہ ہندوستان
کی سب سے بڑی آبادی کے ترجمان ہیں اور انھوں نے
جو کچھ لکھا ہو دیکھ بھال کر اور محسوس کرکے لکھا ہو۔
یہی وجہ ہو کہ ان کے افسانے اس درجہ موثر اور دلکش
ہوتے ہیں شیخ و برہمن کے نام سے ان کے سولہ افسانوں
کا مجموعہ حال میں شایع ہوا ہو کتابت و طباعت
عمدہ، کاغذ سفید ضخامت ۳۲۰ صفحات کتاب
مجلد گرد پوش سے آراستہ قیمت عہ (ساقی)

پریم کی چوڑیاں

(ڈاکٹر اعظم کریوی)

ڈاکٹر اعظم ملک کے چند مخصوص افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کا مقصود ملک کے ادنیٰ و اوسط طبقہ کے ہر پہلو کو نمایاں کر کے اسکی اصلاح کرنا ہے، زبان، پلاٹ اور طرز ادا کے لحاظ سے یہ افسانے انھیں تمام خصوصیات کے حامل ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے دوسرے مقبول افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ —————— نگار ۴۳ء

"ان کے افسانوں کا رنگ عموماً سماجی اور کنایۃً اصلاحی ہوتا ہے، ان کے افسانے ہندستانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی روایات اور زندگی کی حقائق کی صحیح تصویر ہوتے ہیں، اس مجموعے میں بارہ کہانیاں ہیں جن میں شہری اور دیہاتی زندگی سب ہی کچھ آگیا ہے" (ہماری زبان ۴۳ء)

جیبی تقطیع ۲۳۰ صفحات مجلد مع رنگین گردپوش قیمت عا/

یارانِ میکدہ

(عبدالشکور ایم اے۔ بی ٹی)

یہ کتاب کئی سال ہوئے جب شایع ہو چکی ہے۔ اس کی قبولیت کی ایک دلیل یہی ہے کہ اس کا دوسرا اڈیشن مع ترمیم و اضافے کے شایع ہو رہا ہے، اُردو میں اب کردار نگاری کی تو کمی نہیں ہے لیکن ایسے مضامین جو خاص طور پر کردار ہی کو مرکز قرار دیکر اس طرح لکھے جائیں کہ قدم قدم پر نفسیاتی اشارے مل جائیں ان کی کمی ضرور ہے، یہ مجموعہ ایسے ہی مضامین پر مشتمل ہے۔ مصنف نے خود ان مضامین کے لیے "قلمی چہرے" کے لفظ استعمال کئے ہیں اور یقیناً بعض کرداروں کے خط و خال ایسے واضح اور روشن طور پر نمایاں ہو گئے ہیں کہ ہم انھیں چلتا پھرتا بازاروں اور راستوں پر دیکھ سکتے ہیں اپنے گھروں کے اندر پہچان سکتے ہیں، ہم اُن سے ملتے ہیں چاہے انھیں پہچان نہ سکیں جنھیں ایسے کرداروں سے ملنے کا موقعہ ملتا ہے وہ انھیں پہچانتے ہیں جو پہچانتے ہیں ان کا قلم گونگا ہوتا ہے وہ ان کی تصویر نہیں پیش کر سکتے۔ لیکن خوشی ہے کہ عبدالشکور کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ان کا مشاہدہ قوی ہے اور ان کے قلم میں تصویر کھینچ دینے کی طاقت ہے۔ سبک خوبصورت سائز، رنگین گرد پوش، عمدہ کاغذ، اچھی لکھائی چھپائی قیمت مجلد عہ (پروفیسر احتشام حسین)

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ

دھوپ چھاؤں

(عبدالشکور ایم، اے۔ بی، ٹی)

"عبدالشکور علی گڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور وہاں کی زندگی میں جو خوشگوار شوخی کسی زمانہ میں پائی جاتی تھی اس سے خشک سے خشک طالب علم بھی متاثر ہوتا تھا، پھر جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور انسانوں کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے اس کے لئے تو بہت سا مواد مل سکتا تھا عبدالشکور نے زندگی وہیں سے لی ہے، طرز اظہار میں بیباکی وہیں سے لی ہے اور لطیف شوخی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔"

دھوپ چھاؤں کے نام سے عبدالشکور کے مضامین اور افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے ——— پہلی بار جب یارانِ میکدہ نکلا تھا تو ہم نے عبدالشکور کو افسانہ نگار کی حیثیت سے نہیں ایک مضمون نگار کی حیثیت سے جانا تھا جن کے یہاں انشا، مزاح اور نفسیاتی کرید کی آمیزش پائی جاتی تھی ——— دھوپ چھاؤں میں افسانوی انداز زیادہ بڑھ گیا ہے"

کتاب چھوٹے سائز کے ۱۳۶ صفحات پر پھیلی ہے عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ رنگین گرد پوش نے کتاب میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

(آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

مارچ سنہ ۱۹۴۴ء